کے نسبتاً پست معیار اور کم اثرات کی وجہ سے وہ نچلی کیٹیگری کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ گویا کسی تحقیقی مقالہ کو اِن میں سے کسی بھی کیٹیگری میں شائع ہونے سے پہلے اُس کی مقررہ شرائط پر پورا اُترنا ہوتا ہے۔ تحقیقی مجلّہ کے مدیر کو ملنے والے مقالات کی عموماً تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کے مصنفین کو قابلِ اِشاعت تحقیقی مقالہ کے عناصرِ ترکیبی اور اُن کے متعلقہ تقاضوں کا علم ہوتا ہے۔ وُہ اپنے مقالات اُن تقاضوں کے پیشِ نظر لکھتے ہیں تو اُن کے مقالات آسانی سے شائع ہو جاتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ مقالات آتے ہیں جن کے کچھ پہلو اَچھے، کچھ کمزور اور بعض ناقص ہوتے ہیں۔ ایسے مقالات ماہرِ مضمون کی جائزہ رپورٹ کے مطابق نظرِ ثانی اور مجوّزہ ترمیم و اضافوں کے بعد شائع ہو جاتے ہیں۔

تیسری قسم میں وہ مقالات شامل ہیں جن کے مصنّفین مُبتدی، نَوآموز یا کم تجربہ کار ہوتے ہیں۔ اُن کے مقالات چونکہ مطلوبہ معیار پر پورے نہیں اُترتے اِس لیے شائع ہونے سے رَہ جاتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے، وہ ہمت ہار جاتے ہیں، وہ مُلکی ترقی میں اپنا علمی، تحقیقی اور تخلیقی حصہ نہیں ڈال سکتے اور معاشرہ اُن کی خوابیدہ صلاحیتوں کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں اُنہیں اَپنی مشکل کا فوری حل نظر نہیں آتا کیونکہ ایسے مسائل پر قابو پانے کے لیے تربیتی پروگرام اور رہنما تحریریں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ اُردو زبان میں اُصولِ تحقیق یا تحقیق کے فن پر جتنی کتابیں آسانی سے دستیاب ہیں ان میں سے کسی بھی کتاب میں راقم کو تحقیقی مجلات کے مقالات کے عناصرِ ترکیبی، معیار، اُصول و ضوابط اور تقاضوں کو زیرِ بحث لانے والا کوئی منظّم و مرتّب باب، فصل، مبحث یا کوئی رہنما تحریر ابھی تک نظر نہیں آئی۔

اِس پس منظر اور صورت حال میں زیرِ نظر مقالہ کے اَسباب، اَہمیت اور ضرورت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مقالہ قابلِ اِشاعت تحقیقی مقالات کے عناصرِ ترکیبی اور اُن کے تقاضوں کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ راقم الحروف نے اس مقالہ کی تیاری کے دوران علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے متعدد تجربہ کار اساتذہ، محققین، مصنفین، اور جائزہ کاروں (Evaluators) کے انٹرویوز لیے تاکہ مقالات کے جائزہ سے متعلق اُن اساتذۂ فن کی تازہ ترین معلومات، آراء، ارشادات اور رہنمائی کو مقالہ نگاروں کے استفادہ کے لیے پیش کیا جا سکے۔ اِس مقالہ کی افادیت یہ ہے کہ اِس کے مُطالعے اور تفہیم سے ناپختہ، مبتدی اور نَوآموز تحقیق کاروں کو اَپنی مشکل حل کرنے کے لیے رہنمائی اور عملی تجاویز ملیں گی جن کی پیروی کر کے وہ قابلِ اِشاعت تحقیقی مقالات پیش کر سکیں گے۔ اِس طرح جہاں اُن کی ترقی کی ایک رُکاوٹ دُور ہو جائے گی وہاں پاکستان میں نہ صِرف منجھے ہوئے محققین کی تعداد میں اضافہ ہو گا بلکہ اُن کے جدید نظریات، متنوع تحقیقات اور علمی تخلیقات کی بدولت وطنِ عزیز اور اُمّتِ مسلمہ میں علم و ہنر اور تحقیق و تربیت کا معیار بھی بلند ہونے کی قوی امید ہے۔ محققین کی تعلیم و تحقیق کا معیار اعلیٰ ہو گا تو ملکی ترقی کی رفتار بہتر ہو جائے گی۔

تحقیقی مجلات کے مدیرَان کا اُصولی طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جو مقالات بغرضِ اِشاعت انہیں مَوصول ہوتے ہیں وہ اُنہیں موضوع کی نوعیت اور تخصّص کے پیشِ نظر کم از کم دو ماہرینِ مضمون کے پاس جائزے اور ریویو کے لیے بھیجتے اور اُنہیں شائع کرنے یا نہ کرنے کی رائے لیتے ہیں۔ اِس طریقے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی مقالہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک مقالے کا ریفری یا ریویو کرنے والا ماہرِ مضمون کِن اُمور کو بنیاد بنا کر مقالے کا جائزہ لیتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں یہ سوال یوں بھی ہو سکتا ہے کہ قابلِ اشاعت مقالہ کے عناصرِ ترکیبی کیا ہوتے ہیں؟ اور ہر عنصر کو لکھتے وقت کن تقاضوں کو پورا کرنا

ضروری ہوتا ہے؟ اِن سوالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ مقالہ ایچ ای سی کے منظور شدہ تحقیقی مجلات میں قابلِ اِشاعت مقالہ کے مختلف عناصرِ ترکیبی اور اُن کے متعلقہ تقاضوں کو زیرِ بحث لاتا ہے۔

ہمارے اِس مقالہ کی بحث اور اِس کے عناصر ترکیبی کا خاکہ یوں ہے:

1. موضوع کی نوعیت اور ماہیت 2. مقالے کا عنوان 3. مقالے کا انگریزی میں خلاصہ 4. تمہید اور مقدمہ کے اجزائے ترکیبی ا۔ موضوع کا تعارف ۲۔ موضوع کی اہمیت، ضرورت اور افادیت ۳۔ اختیار کردہ موضوع پر تحقیق کے اَسباب ۴۔ تحقیق کا بنیادی سوال، سوالات یا بیانِ مسئلہ ۵۔ موضوع پر سابقہ علمی کام کا جائزہ ۶۔ موضوع پر تحقیق کی حدود ۷۔ تحقیقی مقالے کے اہداف، اغراض اور مقاصد ۸۔ موضوع پر تحقیق کا منہج 5. صُلبِ موضوع ا۔ مباحث و مطالب کی تقسیم کا خاکہ ۲۔ پیراگرافوں اور اقتباسات میں ربط ۳۔ احادیث کے اقتباسات اور اُن پر حکم ۴۔ اِملاء، رسم الخط اور رموزِ اوقاف ۵۔ تحقیقی مقالے کی زبان اور اُسلوب	۶۔ صحت متن ۷۔ رَسمیاتِ مقالہ ۸۔ مقالے میں مذکور شخصیات کے تراجم ۹۔ اخلاقیاتِ تحقیق 6. خاتمہ بحث اور اُس کے اجزائے ترکیبی ا۔ نتائج بحث ۲۔ مسئلہ کا حل اور اُس کے نفاذ کی تجاویز ۳۔ موضوع کے تحقیق طلب پہلوؤں کی نشاندہی 7. مصادر و مراجع ا۔ موضوع کی نوعیت اور مصادر و مراجع ۲۔ مصادر و مراجع کے مرتبے اور درجے ۳۔ کتب لغت، معاجم اور قوامیس کا استعمال ۴۔ حوالہ جات کے اُصول و ضوابط اور تخریج 8. مقالات کی اشاعت میں تاخیر کے اسباب 9. ایچ ای سی کے مجلات، درجہ بندی اور معیار کا فرق 10. خاتمہ و خلاصہ بحث 11. حواشی و حوالہ جات

اب ہم پہلے اِس مقالے کی ساخت اِجمالاً پیش کرتے ہیں۔ اس اِجمال کا آغاز ڈاکٹر تحسین اقبال کی رائے سے کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شعبے یعنی میڈیکل سائنس کے اعتبار سے ریسرچ پیپر یا تحریری مقالے کے تین مختلف اجزاء سر (Head)، جسم (Body) اور دُم (Tail) ذکر کیے ہیں[2] لیکن زیرِ نظر مقالہ کی نظر میں علوم اسلامیہ کے تحقیقی مجلات میں اِشاعت کے قابل اُردو زبان میں لکھے گئے مقالات کے عموماً چھ بڑے اہم حصے یا نمایاں عناصر ہوتے ہیں۔ وہ بالترتیب یہ ہیں: عنوان کی عبارت، مقالے کا انگریزی زبان میں مُلخص (Abstract)، مقدمہ اور تمہید، صُلبِ موضوع جسے بحث و تحقیق کا مرکزی و مفصل حِصّہ بھی کہہ سکتے ہیں، خاتمہ اور مصادر و مراجع۔ عنوان کی عبارت کے بعد موضوع پر بحث کی تمہید اور مقدمہ کم از کم ایک صفحہ اور زیادہ سے زیادہ دو صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ مقالہ کے مقدمہ میں جو آٹھ عناصر شامل ہوتے ہیں وہ یہ ہیں: (۱) موضوع کا تعارف، (۲) موضوع کی اہمیت، (۳) موضوع کو اختیار کرنے کے اسباب، (۴) تحقیق کا بنیادی سوال یا سوالات، (۵) بہت ہی اہم سابقہ مگر

جدید ترین کام کا مختصر جائزہ، (۶) اختیار کردہ موضوع کی حدود، (۷) تحقیقی مقالے کی افادیت، اغراض اور مقاصد اور (۸) منہج تحقیق کی وضاحت۔ قابل اشاعت مقالہ کے مقدمہ میں اِنہی آٹھ عناصر کو جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اِن کے تقاضوں کی تفصیل آگے آتی ہے۔

مقالہ کے دوسرے حصّے یعنی صُلبِ موضوع میں دراَصل تحقیق کے بنیادی سوال، سوالات کے جواب، جوابات ہوتے ہیں جن کے اگر مختلف پہلو ہوں تو پھر موضوع کا مرکزی حصہ مباحث اور مطالب میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اُٹھائے گئے سوال کے جوابات کی ساخت اور بناوٹ میں جن چیزوں کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے وہ یہ ہیں: بحث و تحقیق کے مرکزی حصّے میں شامل اَفکار کی معقول ومُنضبط ترتیب، فکری کڑیوں میں مفید و منطقی رَبط، اِقتباسات، حواشی، تعلیقات، غیر معروف شخصیات کے مختصر تعارف کے لیے چند ضروری جملے، رُموزِ اوقاف اور اُسلوبِ نگارش وغیرہ شامل ہیں۔

مقالہ کے تانے بانے میں یہ سب اُمور مقالہ نگار کی فکر اور سوچ کے مطابق آپس میں اَیسے مربوط اور جڑے ہوتے ہیں جیسے کسی انمول مالا میں حکمت و دانائی اور ماہرانہ ترتیب سے پروئے گئے موتی، ہیرے یا جواہرات ہوتے ہیں۔ اِن کی ترتیب اور باہمی ربط ایسا ہوتا ہے کہ اگر اِن میں سے کسی کو بھی نکال دیا جائے تو تحقیقی مقالہ کی ساری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ مقدمہ بحث سے لے کر خاتمۂ بحث تک ہر جگہ مقالہ نگار کی شخصیت متحرک، فعّال اور چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں وہ اقتباس کے لیے تمہیدی اور تعارفی سطریں لکھ رہا ہوتا ہے تو کہیں اقتباس کے بعد اُس کا تجزیہ (Analysis) کر رہا ہوتا ہے، اقتباس کے مرکزی نکات کی قدر و قیمت پر تبصرہ (Evaluation) کر رہا ہوتا ہے اور اس کی وجہِ اِستدلال بیان کر کے یہ بتا رہا ہوتا ہے کہ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ کہیں وہ متن میں مذکور غیر معروف فاضل اشخاص کا مختصر مختصر تعارف پیش کر رہا ہوتا ہے تو کہیں غیر واضح اور نامانوس اصطلاحات کی تشریح و توضیح پیش کر رہا ہوتا ہے۔ اپنی بحث کے اس مرکزی حصّے میں وہ رُموز او قاف اور رَسمیات و اُسلوبیاتِ تحقیق سے بھی غافل نہیں ہو سکتا۔

مقالہ کے آخری حصہ یعنی خاتمۂ بحث میں مقالہ نگار کو تین اُمور بیان کرنے چاہئیں۔ پہلا اَمر تو نتائج یعنی مقدمہ میں اُٹھائے گئے سوالات کے نکتہ وار جوابات ہوتے ہیں۔ نتائج کو اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ درپیش مسئلہ کا حل نظر آئیں اور یہی چیز حاصل بحث ہوتی ہے۔ دوسرا اَمر مذکورہ مسئلہ کے حل کے لیے سامنے آنے والے نتائج کی روشنی میں حل کے نفاذ کی تجاویز بیان کرنا ہوتی ہیں۔ یعنی بحث و تحقیق کے بعد مقالہ نگار نے درپیش مسئلہ کا جو حل تلاش کر لیا ہے وہ اُس کے اِطلاق اور تنفیذ کے ممکنہ طریقے بیان کرتا ہے۔ تیسرا اور آخری اَمر موضوع کے کسی ایسے پہلو کی نشاندہی کرنا ہوتا ہے جو تحقیق طلب ہو، اُس پر الگ اور مستقل تحقیق کی ضرورت ہو اور جو مقالہ نگار کی پیش کردہ تحقیق کی حدود سے باہر پایا گیا ہو۔ یہاں تجربہ میں آنے والی یہ بات قابل ذکر ہے کہ کچھ موضوعات ایسی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں کہ محقق کی کوشش کے باوجود اُن کا کوئی ایسا پہلو نظر نہیں آتا جس پر مزید تحقیق کی گنجائش پائی جاتی ہو۔

تحقیقی مقالے کے اِن چھ اہم اور اَساسی حصّوں یا عناصر کے اِجمالی بیان کے بعد ترتیب وار اِن سب کے تقاضوں کی تفصیل پیش ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

1. **موضوع کی نوعیت اور ماہیت**

ایک مقالہ نگار کو سب سے پہلے جس چیز پر اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتیں صرف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ تحقیق کے لیے منتخب موضوع کی نوعیت اور ماہیت ہے۔اس کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند (1923۔2007ء)[3] نے مختصر لفظوں میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے: ''تحقیقی مقالہ ڈگری کے لیے لکھا جائے یا ڈگری سے ہٹ کر، دونوں کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔'' گیان چند کے مطابق ایسا ''مختصر مضمون جو کسی رسالے یا یادگاری ارمغاں یا کسی اور مجموعۂ مضامین کے لیے لکھا جائے'' اس کی نوعیت بھی ایم اے، ایم فل یا پی ایچ ڈی کے مقالوں جیسی ہوتی ہے۔[4]

اپنے اس بیان میں پروفیسر گیان چند نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایم اے، ایم فل یا پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات میں جن اُمور کا خاص خیال رکھا جاتا ہے تحقیقی مجلّہ کے لیے لکھے گئے مقالہ میں بھی اُن کا مکمل لحاظ رکھا جاتا ہے۔ موضوع کی نوعیت کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین ہاشمی[5] اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب کوئی ریسرچ تھیسس یا کوئی مقالہ آتا ہے تو اس میں سب سے اہم چیز جو ایک ماہر مضمون (Reviewer) کو دیکھنا چاہیے وہ اس کی اصلیت اور اچھوتا پن ہے کیونکہ تحقیق نام ہی اِس چیز کا ہے کہ آپ کوئی ایسی چیز سامنے لائیں جس سے عِلمی حلقے متعارف نہیں ہیں۔ وہ چیزیں جو پہلے سے موجود اور عِلمی ذخیرہ میں دستیاب ہیں اُنہی کو اگر مقالہ نگار دوبارہ اپنے الفاظ میں لکھ دیں ہے تو یہ تحقیق نہیں ہے۔ تحقیق کے لیے ضروری یہ ہے کہ آپ کا جو عِلمی کام ہے اس میں کوئی جدت اور نیا پن ہو۔[6]

موضوع کی نوعیت اور ماہیت کے بارے میں قدرے مختلف مگر دلچسپ موقف پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید عباسی[7] کا ہے۔ وہ مقالہ نگاروں کی رہنمائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو موضوع ذہن میں آئے اُس کے اَطراف (Genetic Connections) کو دیکھا جائے کہ وہ کس کس چیز سے مربوط اور منسلک ہیں؟ اور کس ربط کے ذریعے سے اس موضوع کے کس نئے پہلو کو سامنے لے آنے میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ بعض دفعہ ایسے موضوعات سامنے آتے ہیں جن پر پہلے سے ہی بے تحاشا معلومات موجود ہوتی ہے مگر لوگ پھر بھی کسی نہ کسی طرح موضوع بنا کر پندرہ بیس صفحے کا مقالہ بھیج دیتے ہیں۔جب اس کا جائزہ لیا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ ساری چیزیں پہلے سے موجود ہیں۔ایسا مقالہ رَدّ ہو جاتا ہے اور اس سلسلے میں ساری کوششوں کا نتیجہ صفر ہی نکلتا ہے۔ ایک نوآموز محقق کو یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ موضوع کا انتخاب چاہے وہ ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی کے مقالہ کے لیے کر رہا ہو یا ایچ ای سی کے منظور شدہ مجلات میں کسی آرٹیکل کو شائع کرنے کے لیے، دونوں کا ایک ہی معیار ہوتا ہے۔[8]

اسی سلسلے میں ڈاکٹر حافظ محمد سجاد[9] کی رائے ایک اور انداز میں اور اُن کے وسیع تجربے کی بنا پر سامنے آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجلات میں اشاعت کے لئے جو مقالات ہمارے پاس آتے ہیں اُن میں سب سے پہلی چیز جو ہم دیکھتے ہیں وہ اُن کا عنوان ہوتا ہے۔ عنوان کے اندر کونسا ایسا پہلو ہے جو قابل تحقیق ہے؟ عنوان تشریحی ہے؟ اس کے اندر دعوت کا پہلو ہے؟ یا وہ کسی پُرانی بات کو دُہرا رہا ہے؟ یا کسی پرانے آرٹیکل پر نقد ہے؟ یہ ساری چیزیں دیکھنے کے بعد ترجیح اُس مقالے کو دی جاتی ہے جس میں کوئی نیا پن ہو، کوئی جدت ہو، جس میں تحقیق کا کوئی پہلو اُجاگر کیا گیا ہو۔ یونیورسٹیوں کے ریسرچ جرنلز میں اِشاعت کے لیے جو مقالات لکھے جاتے ہیں اُن کے لیے ضروری ہے کہ عنوان کے اندر گہرائی اور نیا پن ہو۔ اُنہیں باقاعدہ ریسرچ کے لئے منتخب کیا گیا ہو۔[10]

تجربہ کار ماہرین مضمون کی اِن آراء پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سب موضوع کے نئے پن، اس کی جدت، تحقیقی نوعیت، منفعت اور افادیت پر نہ صِرف زور دیتے ہیں بلکہ مقالہ نگاروں سے اِسی کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ وہ صِرف اُسی مقالے کو قابلِ اِشاعت قرار دیتے ہیں جس میں انسانیت یا ملک و قوم کو درپیش زندہ مسائل کے لیے حل، رہنمائی اور رُشد وہدایت کا سامان بھی پایا جاتا ہو۔

2. مقالے کا عنوان

مقالے کو ریویو کرنے والے ماہر مضمون کی نظر عموماً سب سے پہلے جس چیز پر پڑتی ہے وہ ہے پیش کردہ مقالہ کے عنوان کی عبارت۔ اس عبارت کو واضح اور غیر مبہم ہونا چاہیئے۔ اِسے ایسا جامع، مانع اور صاف ہونا چاہیئے کہ اس کی بناوٹ، ساخت اور بندشِ تراکیب پر کوئی سوال یا اعتراض پیدا ہی نہ ہو۔ اگر کسی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو تو پھر مقالے کے تعارفی پیراگرافوں میں موضوع کے تعارف اور اس کی عبارت کے متعدد حصوں کی وضاحت اس انداز سے کر دی جائے کہ اس کا ابہام یہاں بالکل دُور ہو جائے۔ عنوان کی عبارت کے بارے میں ڈاکٹر تحسین اقبال لکھتے ہیں:

”اسے عام فہم، مختصر، جامع مؤثر اور دلچسپ ہونا چاہیئے۔ ایسا کہ قاری کو فوری متوجہ کرے اور مقالہ پڑھنے کی طرف راغب کرے۔ یہ زیادہ سے زیادہ دَس سے بارہ الفاظ پر مشتمل ہو۔ یہ مقالے کے موضوع سے مطابقت رکھتا ہو اور گرامر کے لحاظ سے دُرست ہو۔ عنوان میں مخفف (Abbreviation) الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے۔ اس میں مقالے کے حتمی نتائج کا اظہار نہ کیا جائے نہ ہی اس کا انداز حتمی یا فیصلہ کُن ہونا چاہیے۔“[11]

عنوان کی عبارت کے ان اوصاف کے ساتھ ساتھ ایک قابل قبول عنوان کے متعدد پہلو اور اُس کی خوبیاں بھی مد نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں معروف محقق ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

”[عنوان] سے مقالہ نگار کے تحقیقی مزاج اور تجزیاتی و تنقیدی ذہن کا اظہار ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے جامع اور معنویت کا حامل ہونا چاہیئے اور مناسب ہے کہ یہ غیر ضروری الفاظ اور طوالت سے پاک، مختصر اور جاذبِ توجہ ہو۔ .... عنوان کے انتخاب میں اختصار اور الفاظ کا جامع و با معنی استعمال بڑی اہمیت اور کشش رکھتا ہے اور عنوان کی جاذبیت ہی مقالے کو قابِل توجہ بنا سکتی ہے۔“[12]

علوم اسلامیہ کے جو مقالہ نگار عربی زبان جانتے اور اسے پڑھنے لکھنے کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں انہیں عنوان کی عبارت کے بارے میں تفصیلی بحث کے لیے شریف حاتم بن عارف عَونی کی کتاب ”العنوان الصحیح للکتاب: تعریفه وأهمیته، وسائل معرفته وإحکامه، أمثلة للأخطاء فیه“[13] کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت مفید ہے۔

عنوان کی عبارت کا مختصر، جامع، مؤثر اور جاذب نظر ہونا ایک بات ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ عنوان کی عبارت کے تقاضے اور مقالے کی مرکزی بحث میں موافقت اور مکمل ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ اِسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد سجاد کہتے ہیں کہ عام پایا جانے والا مسئلہ یہ ہے کہ مقالہ نگار بعض دفعہ عنوان بہت عمدہ دیتے ہیں جس میں تحقیق کا پہلو بھی موجود ہوتا ہے لیکن مقالہ کی ساری بحث عنوان کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ یعنی بات سمجھ میں بالکل نہیں آتی کہ مقالہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے؟ اوپر عنوان کچھ ہے اور نیچے متن بالکل اور ہے۔ کئی مقالات میں یہ چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً ایک مقالہ کا عنوان تھا ”عہد نبوی میں فقہ اسلامی کے مصادر“۔ یہ عنوان بہت ہی حیران کن ہے کہ خود عہد نبوی میں فقہ اسلامی کے مصادر کہاں پائے

جا سکتے ہیں؟ مقالہ لکھنے والے ایک یونیورسٹی کے فُل پروفیسر تھے۔ انہوں نے یہ عنوان وضع کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فقہ کی تو تدوین ہوئی ہے دوسری یا تیسری صدی میں۔ اب یہ عنوان کہنا کیا چاہتا ہے؟ جب مقالہ پڑھا تو پتا یہ لگا کہ مقالہ نگار یہ بتانا چاہتا ہے کہ حضور ﷺ کے اُسوہ حسنہ اور آپ کے عمل سے فقہ اسلامی کی کون کون سے نظیریں ملتی ہیں۔[14]

ڈاکٹر محمد سجاد کی بات بالکل درست ہے۔ راقم الحروف کا اپنا تجربہ بھی ان کی تائید کرتا ہے کہ عنوان اگرچہ بہت عمدہ ہوتا ہے لیکن مقالہ نگار جس میدان میں یا جس موضوع پر لکھ رہا ہوتا ہے اسے پیش نظر نہیں رکھتا۔ عنوان اور اُس کے تحت پیش کردہ معلومات میں معقول اور مطلوب ہم آہنگی نہ پائی جائے تو پڑھنے والا اُس سے متنفر ہو جاتا ہے۔ ایسے مقالات کیسے چھپ سکتے ہیں؟ اس لیے اولین چیز عنوان ہے۔ اُسے واقعی دِقت نظر سے دیکھا جائے کہ کیا مقالے کے منہج اور عنوان میں ہم آہنگی اور مطابقت ہے یا نہیں؟ مقالہ نگار اِس نکتے پر دھیان دیں گے تو اُن کے مقالے کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوگا۔

مقالہ کا عنوان لکھتے وقت تیسری اہم بات جس سے مقالہ نگار کو غافل نہیں ہونا چاہیے یہ ہے کہ عنوان کی عبارت کو دو حصوں میں لکھنا بہتر ہوتا ہے۔ پہلے حصّے میں موضوع کے بڑے یا وسیع پہلو کو پیش کیا جاتا ہے جبکہ دوسرے حصے کے الفاظ سے موضوع کی حدود اور تخصیص کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس دوسرے حصّے کو بعض لوگ کولن (:) کے بعد اور کچھ لوگ چھوٹی بریکٹ یعنی ( ) میں لکھتے ہیں جیسا کہ خود زیر نظر مقالہ کے عنوان کی عبارت دو اجزاء میں تقسیم ہے۔ عنوان کی عبارت کو اس طرح دو حصوں میں لکھنے سے موضوع پر کام کا حدود اربعہ اور منہج آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ مقالہ نگار عنوان کی عبارت کے ذریعے اپنے کام کی نوعیت، اس کی حدود اور افادیت سمجھانے میں اگر کامیاب ہو جائے تو اگلے مَراحل میں کامیابی کے اِمکانات بڑھ جاتے ہیں۔

3. مقالے کا انگریزی میں خلاصہ

مقالے کے موضوع کی نوعیت اور ماہیت ایک فکری، نظری، ذاتی ترجیح اور ابلاغی معاملہ ہے جس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد مقالے کی جو چیز سب سے پہلے ماہر مضمون (Reviewer) کی نظروں میں آتی ہے وہ اُس کا انگریزی زبان میں لکھا خلاصہ (Abstract) ہوتا ہے۔ یہ مُلخص ایسی عبارت میں پیش کیا جائے جس کے جملے بہت طویل اور گنجلک نہ ہوں۔ اس میں مناسب جگہوں پر فُل سٹاپ، کامے، سیمی کولن، قوسین وغیرہ رموزِ اوقاف لگائے جائیں۔ طویل جملے اور پیچیدہ تراکیب آسانی سے قارئین کی سمجھ میں نہیں آتے ہیں۔ جس خلاصے کا پیغام قارئین تک نہ پہنچ سکے اس کی کوئی افادیت نہیں ہوتی ہے۔ اس میں سپیلنگ اور انگریزی گرامر کی غلطیاں بالکل نہ ہوں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ (Abstract) اپنے مقالے کے تمام اہم نکات کی مناسب تلخیص بھی ہو۔ مقالہ نگار کو اس طرف پوری توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

مقالے کے (Abstract) کی ساخت، انداز اور مقصد کے بارے میں ڈاکٹر محمد سجاد کہتے ہیں کہ بعض دفعہ تلخیص میں لوگ اپنے مقالے کے مندرجات کو دوبارہ بیان کر دیتے ہیں۔ جبکہ تلخیص سے مراد یہ ہے کہ اس مقالے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کو ایک بیانیہ انداز میں لکھ دیا جائے۔ مقالہ نگار کیا کرتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میں نے یہ لکھا ہے، میں نے وہ لکھا ہے، میں نے یہ کیا ہے۔ یہ تلخیص نہیں ہے۔ یہ Abstract نہیں ہے بلکہ آپ مقالے کی ایک outline دے دیں۔ مقالے کے مرکزی نکات کا خلاصہ اور مضمون بیان کر دیں۔ اسے Abstract کہتے ہیں۔ تاکہ کوئی آدمی اگر آپ کا پورا مقالہ نہیں پڑھنا چاہتا۔ اس کے

پاس تھوڑا وقت ہے تو آپ مقالے کا بنیادی سوال بیان کر دیں، اس کا جواب کیا دیا ہے اور نتیجہ کیا نکالا ہے؟ یہ بتا دیں تو یہی سمری ہے۔[15]

4. تمہید اور مقدمہ کے اجزائے ترکیبی

مقالے کے موضوع پر مرکزی بحث سے پہلے مقالہ نگار کو اپنی بحث کی بہتر تفہیم کے لیے ایک مناسب تمہید اور مقدمہ لکھنا ہوتا ہے۔ اختیار کردہ موضوع کے تعارفی پیراگرافوں سے پہلے تمہید باندھی جاتی ہے۔ اس تمہید میں موضوع کے وسیع تناظر یا سیاق کو بیان کیا جاتا ہے۔ تمہید لکھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی کچھ جملوں میں موضوع کی ایسی باتیں بیان کی جائیں جو قارئین کو عام طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ معلوم باتیں کرتے کرتے قاری کو موضوع کے اُس پہلو کی طرف لے آیا جائے جو نامعلوم، جدید اور اچھوتا ہو۔ یہ وہ پہلو ہوتا ہے جس پر مقالہ نگار اپنی تحقیق آئندہ صفحات میں پیش کرنے جا رہا ہوتا ہے۔ یعنی تمہید میں مقالہ نگار اپنے قاری کو موضوع کے معلوم سے نامعلوم پہلو کی طرف اور موضوع کے عام پہلو سے خاص پہلو کی طرف لے آتا ہے۔ تمہید میں دراصل محقق اپنے قارئین کے لیے ایسا علمی ماحول، سیاق اور تناظر مہیا کرتا ہے جس کی مدد سے اُن کا ذہن بات کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

تمہید کے بعد موضوع پر بحث کا مقدمہ جو کم از کم ایک صفحہ اور زیادہ سے زیادہ دو صفحات پر مشتمل ہوتا ہے کے آٹھ عناصر ترکیبی یہ ہیں: (۱) موضوع کا تعارف، (۲) موضوع کی اہمیت، (۳) موضوع کو اختیار کرنے کے اسباب، (۴) تحقیق کا بنیادی سوال یا سوالات، (۵) بہت ہی اہم سابقہ مگر جدید ترین کام کا مختصر جائزہ، (۶) اختیار کردہ موضوع کی حدود، (۷) تحقیقی مقالے کی افادیت، اغراض اور مقاصد، اور (۸) منہج تحقیق کی وضاحت۔ اِن کے تقاضے اور لکھنے کے اُسلوب کی تفصیل درج ذیل میں پیش ہے۔

(۱) موضوع کا تعارف

عنوان کی عبارت کا جائزہ لینے کے بعد ماہرِ مضمون (Reviewer) موضوع کے تعارف کو پڑھتا اور اُس کا جائزہ لیتا ہے کیونکہ کسی بھی موضوع پر تحقیق سے پہلے اس کا تعارف پیش کرنا بنیادی عنصر ہوتا ہے۔ تعارف میں مقالہ نگار یہ واضح کرتا ہے کہ اُس کے نزدیک موضوع کے اختیار کردہ جدید اور اچھوتے پہلو کا کیا معنی اور مفہوم ہے؟ اس کا منتخب موضوع اپنے سیاق و سباق کے وسیع فکری تناظر میں کہاں واقع ہے؟ اس کا تعلق معاشرے کے کس طبقے، گروہ، کاروبار، پیشے یا ادارے سے ہے؟ اور اس کے بارے میں آئندہ صفحات میں کیا کچھ پیش کرنا چاہتا ہے؟ یعنی موضوع کے وہ کونسے جدید پہلو ہیں جنہیں زیر بحث لانے کا مناسب وقت اب آ گیا ہے؟ جن پر مقالہ نگار اپنا قلم اُٹھانا چاہتا ہے؟ اور اس کے جن پہلوؤں پر وہ اپنی تحقیق پیش کر رہا ہے اس کی شکل و صورت، چہرہ مُہرہ اور خد و خال کیا ہیں؟ اس جگہ مقالہ نگار عنوان کی عبارت میں شامل اصطلاحات، مرکبات (توصیفی یا اضافی) یا کلیدی تراکیب کے معانی اور مفاہیم کی تشریح و توضیح اس انداز میں کرتا ہے کہ ریویو کرنے والا ماہرِ مضمون جان لیتا ہے کہ آئندہ صفحات پر کیا نئی تحقیق پیش کی جانے والی ہے۔ موضوع کے تعارف کو خوب صورت الفاظ اور دلچسپ تراکیب کی مدد سے جاذبِ توجہ بنانا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ جب ماہرِ مضمون اُس کے حُسن کی سحر انگیزی میں آ جائے تو پھر آگے آگے پڑھتا ہی جائے۔

(۲) **موضوع کی اہمیت، ضرورت اور افادیت**

تحقیق کار موضوع کے تعارف کے بعد اپنے موضوع پر تحقیق کی اہمیت، ضرورت اور افادیت بیان کرتا ہے۔ کسی موضوع پر ایک تحقیق کی اِفادیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے قارئین میں سے کس کس فرد یا گروہ کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ اس لیے ایک مقالہ نگار کو یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ موضوع کے جس مسئلے یا پہلو کو وہ زیر بحث لانا چاہتا ہے دَورِ حاضر میں اُس کا تعلق معاشرے کے کن خاص لوگوں سے ہے؟ اُس مسئلے کا حل تلاش کرکے پیش نہ کیا گیا تو متعلقہ لوگوں کو کیا کیا ضرر اور نقصانات پہنچیں گے؟ اسے اس پر لازماً عقلی اور مشاہداتی وزنی دلائل دینا چاہئیں کیونکہ اِسی سے اس کے تحقیقی کام کی قدر و منزلت متعین ہوتی ہے۔

موضوع پر تحقیق کی مقصدیت اور افادیت کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی کہتے ہیں کہ جدت اور اچھوتے پن کے ساتھ ساتھ تحقیقی کام کا معاشرے کے ساتھ تعلق ہو، اُس کی کوئی افادیت ہو۔ تحریر بہت ہی جدید اور بالکل نئی ہے لیکن معاشرے کے لئے نفع بخش نہیں ہے تو اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں علم نافع کا جو تصور ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ سوسائٹی کے لیے وہ علم فائدہ مند ہے۔ علم تو بہت سارے ہیں اور اُن میں ہونے والی ریسرچ میں جدت بھی ہے۔ لیکن کیا اُس ریسرچ کا معاشرے کو کوئی فائدہ ہوگا یا نقصان؟ علم نافع کی اخلاقیات اور جو شرعی تقاضے ہیں، کیا وہ اِس تحقیق سے متاثر ہوں گے یا نہیں؟ تو اِس حوالے سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معاشرے کو پیش کردہ تحقیق سے کتنا نفع پہنچے گا؟ یعنی تحقیق برائے تحقیق نہیں بلکہ ایک بامقصد تحقیق ہونی چاہیے۔ [16]

یہاں ڈاکٹر ہاشمی نے علم نافع کی جو بات کی ہے وہ صرف درست ہی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی تحقیق کا ایک بنیادی اور لازمی تقاضا ہے۔ حضرت اِم سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نمازِ صبح کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگا کرتے تھے: "اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا، وَرِزْقًا طَيِّبًا، وَعَمَلًا مُتَقَبَّلًا" [17]۔ ایک صحیح حدیث میں تو حضور نبی کریم نے اپنی امت کو اللہ تعالیٰ سے علم نافع مانگنے اور غیر نافع علم سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے: "سَلُوا اللَّهَ عِلْمًا نَافِعًا، وَتَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ" [18]۔ نفع بخش تحقیق تو ایک مسلمان کو مرنے کے بعد بھی اجر و ثواب دلاتی رہتی ہے۔ اسی کی اہمیت سمجھاتے ہوئے ایک بار نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ" [19]۔ ان احادیث میں نو آموز مقالہ نگاروں کے لیے ایک اہم سبق یہ ہے کہ وہ جب اپنا مقالہ لکھیں تو اُس کے مقدمہ میں اپنے تحقیقی کام کی منفعت اور افادیت معقول دلائل سے واضح کریں اور بتائیں کہ اُن کے کام کی وجہ سے ملک و ملت کو کونسے فوائد ملیں گے؟ معاشرے کے کس طبقے کی کون کون سی اغراض پوری ہوں گی؟ تحقیقی کام کے منافع صرف بتانے کی حد تک نہ ہوں اُس کام میں درحقیقت لوگوں کے مسائل کا حل بھی پایا جاتا ہو۔ وہ کام علمی سرقہ اور نقل محض بالکل نہ ہو۔ اُن کی تحریر میں کسی سابق مصنف کے کام کو اپنا کام بتانے کی کوشش بالکل نہ ہو۔ معتبر اور قابل اعتماد محقق بننے کے لیے اِن عام خرابیوں سے پرہیز لازمی ہے۔

(۳) **اختیار کردہ موضوع پر تحقیق کے اَسباب**

کسی موضوع پر ایک محقق جب بھی قلم اُٹھاتا ہے تو اس کام کے معقول، علمی، مشاہداتی، تجرباتی اور واقعاتی اَسباب ہوتے ہیں۔ مقالہ نگار اپنے معاشرے، علمی ماحول، یا دَور میں پائے جانے والے اُن اَسباب اور محرکات کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے اُسے اَپنے منتخب موضوع پر قلم اُٹھانے اور اپنی تحقیق پیش کرنے پر تحریک دی تھی۔ تحقیق میں اُن وجوہات کا بیان ضروری ہوتا ہے جو

ایک محقق کو تحقیق کرنے پر برانگیختہ، مجبور یا متحرک کرتے ہیں تاکہ تحقیق کی جڑیں معاشرے کی فکری یا عملی سرگرمیوں میں پیوست نظر آئیں۔ علاوہ ازیں یہ اَسباب روز مرہ کے باہمی معاملات یا مقامی، قومی یا بین الاقوامی تعلقات میں جدت یا کھنچاؤ کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل بھی ہو سکتے ہیں۔

اسی سلسلے میں پروفیسر ڈاکٹر عبد الحمید عباسی اسبابِ انتخابِ موضوع کی انواع بیان کرتے ہوئے بہت اچھی بات کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم موضوع کے انتخاب کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ اس کے اَسباب کیا ہو سکتے ہیں؟ تو میرے نزدیک یہ ہے کہ اہمیت کے اعتبار سے موضوع کا انتخاب کرنا، افادیت کے اعتبار سے موضوع کا انتخاب کرنا، ضرورت کے اعتبار سے موضوع کا انتخاب کرنا، محقق کی ذاتی معلومات کے اعتبار سے موضوع کا انتخاب کرنا، مارکیٹ کے اندر موضوع سے تعلق رکھنے والی کتب اور مقالات کی بہتات اور کثرت بھی اختیار موضوع کے اسباب بنتے ہیں۔ اسی طرح آنے والی دنیا کے لیے اس کی جو مشکلات ہیں ان کا حل تلاش کرنا بھی موضوع کے انتخاب کا ایک سبب بنتا ہے۔[20]

اس تناظر میں اَسبابِ اختیارِ موضوع کا تفصیلی بیان تو ایم اے، ایم فل، یا پی ایچ ڈی کے مقالہ کے خاکہ یا مقدمہ میں ہوتا ہے۔ محدود صفحات کے ایک ریسرچ پیپر میں اِن کا مختصر بیان ضروری ہوتا ہے تاکہ جن وجوہات کی بنیاد پر تحقیق کا کام کیا گیا تھا بعد میں وہ کام معاشرے کو فائدہ پہنچاتا ہوا محسوس بھی ہو۔

(۴) موضوع پر سابقہ علمی کام کا جائزہ

آج کی سائنسی اور ٹیکنالوجی کے وسیع استعمال والی دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر کسی نہ کسی محقق نے کوئی تحقیق پیش نہ کی ہو۔ اس لیے کسی موضوع پر تحقیق سے پہلے یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ موضوع کے متعلق پہلے کیا اور کتنا کام ہو چکا ہے؟ اور کہاں کہاں مزید تحقیق کی گنجائش ہے؟ یعنی وہ کونسا خلا یا کمی ہے جسے یہ تحقیق پورا کرے گی۔ کوئی بھی تحقیق اُس وقت مفید تحقیقی کام کہلاتی ہے جب وہ پہلے سے موجود کام میں کچھ نہ کچھ یا کسی نہ کسی لحاظ سے اضافہ کرے یا کسی تحقیق کے لیے بنیاد کا کام دے یا جدید مسئلے کا حل پیش کرے۔ اس کے لیے سابقہ اور بہت جدید اہم کام کا جائزہ لینا اور خلا کی نشاندہی کرنا تحقیق کی اَساسی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے مقالہ نگار کو موضوع کے متعلق سابقہ کام کا تجزیہ و تحلیل، اس کی وُسعت و گہرائی، اس کی قدر و قیمت اور افادیت کی حدود اور اپنے موضوع کے خلا کی نشاندہی کرکے اپنے تحقیقی مقالہ کا جواز بیان کرنا چاہیے چاہے یہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔[21]

(۵) تحقیق کا بنیادی سوال، سوالات یا بیان مسئلہ

مُخلص محققین دراَصل اَیسے چاق وچوبند شکاری کی طرح ہوتے ہیں جو مشکلات اور مسائل کی تلاش اور شکار کرنے میں لگے رہتے ہیں تاکہ اپنے ناخُنِ تدبیر کی پُھرتیوں سے اور آلاتِ تفکیر کی چُستی سے اُن سوالات کی پیچیدگیوں کو اِس طرح سُلجھائیں کہ مُلک وملّت کے ساتھ ساتھ انسانیت کو فائدہ ہو۔ مقامی افرادِ معاشرہ کے ساتھ ساتھ دور دراز کے لوگ بھی نقصان سے بچیں اور ترقی کریں۔ تمام سنجیدہ محققین اور تحقیقی کام کا جائزہ لے کر اس کی اِشاعت کی سفارش کرنے والے ماہرین مضمون اس امر پر متفق ہیں کہ ہر تحقیق کسی نہ کسی سوال کا جواب ہوتی ہے۔ ہر تحقیق کسی نہ کسی مشکل کو حل کرتی ہے۔ ہر تحقیق کسی نہ کسی کام کو آگے بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔ اس لئے مقالہ نگار کو اپنے منتخب موضوع پر تحقیقی کام کا ایک یا زیادہ قابل فہم مشکل مسئلہ اور اُس

سے متعلق تحقیق طلب سوال یا سوالات بیان کرنا چاہیئے۔ سوالات کی معقولیت اور وزن سے مقالے کی اہمیت اور قدر و قیمت طے ہوتی ہے۔

تحقیق کے بنیادی سوالات کو نمبر وار ذکر کرنے سے پہلے ایک تعارفی پیرا لکھا جاتا ہے جس میں مسئلہ برائے تحقیق کی توضیح اور بیان ہوتا ہے۔ اس بیان کو تحقیقی مقالہ کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس میں ایک مقالہ نگار یہ واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ موضوع کے وسیع و عریض اور جدید و قدیم میدانوں میں سے کس جدید اور اچھوتے پہلو پر وہ ایک مفید اور مطلوب تحقیق پیش کرتا ہے۔ مقالہ نگار اپنے قاری کو یہ بتانے کی پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ کونسی مشکل ہے جسے سابقہ یا معاصر محققین نے نہ تو چھوا اور نہ ہی حل کیا؟ یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ مقالہ نگار اُس خلا کی وضاحت کرے جو اَب تک کی تحقیقات سے رہ گیا ہے اور جس کی طرف پہلے کسی محقق نے اِلتفات نہیں کیا۔ اَفرادِ اُمت کو درپیش کسی مشکل مسئلہ کی واضح نشاندہی کرکے ہی کسی موضوع پر تحقیق پیش کی جانی چاہیئے۔ اس کا فقدان مقالہ کی ایک بنیادی خامی شمار کی جاتی ہے۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ بہت سے مقالہ نگار تحقیق طلب سوال ہی وضع نہیں کر سکتے۔ یہ انداز بھی سامنے آیا ہے کہ سوال تو معقول ہوتے ہیں مگر وہ موضوع کے عنوان، مقالہ میں پیش کی گئی بحث اور مقالہ کے نتائج سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ اس خامی اور کمزوری کو دور کرنے کے لیے نوآموز تحقیق کاروں کو اپنے منتخب کردہ موضوع کے مختلف گوشوں کی واقفیت اور معلومات حاصل کرنے کے لیے مختلف سوالات وضع کرنے چاہئیں۔ اُردو زبان میں سوالیہ جملوں کی تشکیل کے لیے کئی حُروف اور اَلفاظ پائے جاتے ہیں۔ اُن میں سے یہ دَس ''کب، کتنا، کدھر، کس، کن، کہاں، کونسا، کیا، کیسے، اور کیوں'' اکیلے یا تکرار کے ساتھ زیادہ اِستعمال ہوتے ہیں۔ مذکر مؤنث اور واحد جمع کی ضرورتوں کی بنا پر اِن سے مزید کئی اَلفاظ اور تراکیب بھی بنتی ہیں جنہیں اُن کی نوعیت اور استعمال کے مقامات کی بنیاد پر مختلف قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اُن اَقسام اور تراکیب کا ایک خاکہ درج ذیل جدول میں پیش ہے۔

سوال کی نوعیت	سوالیہ الفاظ
ظرف مکان	کہاں، کہاں پر، کہاں سے، کہاں تک، کس جگہ، کس سمت، کس مقام پر، کس مکان میں، کدھر، وغیرہ
ظرف زمان	کب، کب سے، کب تک، کس وقت، کس دن، کس ہفتہ میں، کس مہینہ میں، کس سال، کس سَن میں، کس صدی میں، کس زمانے میں، کس دور میں، کس موقع پر، وغیرہ
افراد، مقدار یا تعداد	کس، کس سے، کس کو، کس نے، کس پر، کسے، کون، کس کے لیے، کِن کے لیے، کس کی خاطر، کتنا، کتنے، کتنی، کتنوں، کتنوں پر، کتنوں کو، کتنوں سے، کتنوں کے لیے، کتنی بار، کن کو، کونسا، کونسی، کونسے، وغیرہ
ماہیت یا حقیقت	کیا؟ کیا کیا؟
وجوہات، اسباب یا طریقہ کار	کیسے، کس طرح، کیوں، کس لئے، کس وجہ سے، کن وجوہات سے، کس سبب سے، کس بنا پر، کس بنیاد پر، کس لحاظ سے، کس حساب سے، کس طریقے سے، کس نیت سے، کن محرکات سے، وغیرہ

اگر اِن استفہامیہ اَلفاظ و تراکیب کو لے کر مقالہ نگار اپنے عنوان کی عبارت کو شامل سوالات بنائیں تو معلوم ہو گا کہ بعض سوالات کے مزاج کا تقاضا ایک مختصر جواب ہے جبکہ کچھ سوالات ایسے بھی ہیں جن کے جواب میں وضاحت اور تفصیل

مطلوب ہوتی ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ دستیاب وقت، قابلِ رَسائی مآخذ اور دسترس میں آنے والے ذخائر مواد کے پیش نظر اِس دوسری قسم کے سوالات میں سے مناسب سوالات منتخب کریں اور ان کے مدلل و مستند جواب کے لیے بنیادی و اساسی مآخذ سے مواد جمع کریں، اس کا عالمانہ تجزیہ و تحلیل کریں، اور مفید و دلچسپ نتائج کا استنباط کریں۔

یہاں بعض سوالیہ الفاظ کے بارے میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ سوال کی عبارت میں انہیں دُہرا دیا جائے تو سوال اور اُس کے جواب میں وُسعت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اُن کی نوعیت واحد سے جمع میں بدل جاتی ہے۔ مثلاً وہ سوال جس میں ''کس کس کو'' یا ''کون کون'' کے الفاظ ہوں اس کا تقاضا اس سوال کے تقاضے سے مختلف ہوتا ہے جس میں 'کس کو'، 'کون' صرف ایک بار مذکور ہوں۔ سوال کی وُسعت کو کم یا زیادہ کرنے کے لیے اس قسم کے انداز سے مدد لی جا سکتی ہے۔

اِن الفاظ اور طریقہ کار کو اختیار کرنے سے وہ ایک قابلِ اِشاعت مقالہ لکھنے کے لائق ہو سکتے ہیں۔ اس طرح جب ایک جائزہ کار ان کے مقالے کا جائزہ لے گا تو اُسے یہاں کوئی خامی نہیں ملے گی۔ وہ بڑے اطمینان سے اِس عنصر کے پورے نمبر دے گا۔ اس کے بعد وہ اُٹھائے گئے سوال، سوالات کے جوابات کی علمیت، قیمت استدلال، افکار کی ترتیب، منطقیت اور سوالات سے ہم آہنگی کا جائزہ لے گا۔ یہاں بھی وہ اگر مقالہ نگار کی مہارت سے متاثر ہو گیا تو مقالہ کی اشاعت کی سفارش کرے گا۔

(۶) موضوع پر تحقیق کی حدود

تحقیق کا عمل ایک مسلسل اور وسیع عمل ہے۔ بے شمار موضوعات ایسے ہیں جن پر بہت سے لوگوں نے نہ صرف ماضی میں لکھا بلکہ اَب بھی اُن پر اَن گنت اصحابِ قلم اپنی تحقیقات شائع کر رہے ہیں۔ تحقیقی کام زمان و مکان کی حدود میں مقید نہیں رہ سکتا۔ مختلف اَدوار میں ایک ہی موضوع پر کئی کئی کتب شائع ہوئی ہیں۔ کسی معروف پاکستانی یونیورسٹی کی لائبریری کے آن لائن کیٹالاگ میں کوئی کلیدی لفظ لکھ کر تلاش کریں تو ایک ہی موضوع سے متعلق کئی پُرانی اور نئی کتابوں کی دستیابی کا اندازہ ہو جائے گا۔ مثلاً ادارہ تحقیقات اسلامی نزد فیصل مسجد اسلام آباد کی لائبریری جو کہ ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری کے نام سے موسوم ہے کا آن لائن کیٹالاگ (http://irikoha.iiu.edu.pk:64446/cgi-bin/koha/opac-main.pl) یا اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا آن لائن کیٹا لاگ (http://library.iub.edu.pk/iublibrary/) یا پاکستانی تحقیقی مجلات میں اسلامی تحقیق کا اشاریہ (http://iri.aiou.edu.pk/indexing/) ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

مختلف موضوعات پر اردو، انگریزی اور عربی وغیرہ زبانوں میں کتابوں کی بہتات ہے۔ اس لئے مقالہ نگار کو اپنے تحقیق طلب موضوع کی حدود ضرور بیان کرنی چاہئیں۔ اُسے واضح کرنا چاہیئے کہ اس کا مقالہ سابقہ کام سے کیسے، کتنا اور کیوں مختلف ہے؟ اگر مقالہ نگار کو اس کے موضوع سے ملتا جُلتا کام ملے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ واضح کرے کہ اس کا مقالہ شائع شدہ مقالات سے کیسے مختلف ہے؟ اور اس میں کیا نئی تحقیق شامل ہے؟ پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر ایک جگہ لکھتے ہیں: ''جس طرح سفر پر روانہ ہونے سے پہلے مسافر کے لئے منزل کا تعین اور راستے کے نشیب وفراز سے آگاہ ہونا اور راہِ منزل کے خط [کذا] وخال اور معالم ونشانات جاننا بھی سہولت وافادیت کا باعث ہوتا ہے اسی طرح کسی موضوع پر گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل اس کی تعریف و تحدید اور اس کے لوازمات وملابسات سے آگاہی بھی بے حد مفید وکار آمد ہوتی ہے۔''[22]

پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے یہاں موضوع کی تعریف، تحدید اور اس کے متعلقات کی نشاندہی پر جس طرح زور دیا ہے اس سے نو آموز مقالہ نگار کے لیے کئی مفید اسباق سیکھ سکتے ہیں۔ کسی بھی مقالہ میں بیان کردہ حدود کا اِطلاق نظر آنا چاہیے کیونکہ اس سے تحقیقی عمل کے منضبط، مرتّب اور منظّم ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

موضوع پر تحقیقی کام کو کئی لحاظ سے محدود کیا جا سکتا ہے۔ زمان کے لحاظ سے یا علاقے کے لحاظ سے، قدیم کے لحاظ سے یا جدید کے لحاظ سے، منہج کے لحاظ سے، کسی دین ومذہب کے لحاظ سے یا کسی فرقے کے لحاظ سے، زبان کے لحاظ سے یا زیر مطالعہ ادب کی نوعیت (کتب تفاسیر، کتب شروح احادیث، کتب عقائد، کتب تاریخ، تحقیقی مجلات کے مقالات، کتب جدل ومناظرہ، وغیرہ) کے لحاظ سے یا اِن علوم کی ذیلی شاخوں کے لحاظ سے۔ تاکہ موضوع وسیع ہو کر لا محدود نہ بن جائے۔ اگر بحث و تحقیق کی حدود بیان نہ کی جائیں تو اِس کے متعلقہ تمام پہلوؤں اور قدماء کے ساتھ ساتھ متاخرین کی آراء کا اِحاطہ کرنا نا ممکن بن جاتا ہے۔ موضوع زیر بحث کی حدود بیان نہ کرنا پیش کردہ مقالہ کی بہت بڑی خامی شمار کی جاتی ہے۔

(۷) موضوع پر تحقیق کے اَہداف

مقالہ نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے مقالہ کے مقدمہ میں مقالہ کے اہداف، مقاصد اور اغراض کی معقول وضاحت کرے۔ وہ صاف لفظوں میں یہ بتائے کہ اُس کے مقالے کی اشاعت کے بعد اور اس کے نتائج کی تنفیذ سے ملک پاکستان، پاکستانی معاشرے کے کسی طبقے، گروہ، پیشے، کسی پاکستانی ادارے، عالم اسلام، یا بحیثیتِ مجموعی اِنسانیت کو کیا فوائد حاصل ہوں گے۔ مقالہ میں پیش کردہ تحقیق کی ایسی اِفادیت نہ بتائی جائے، ایسے مقاصد کی جانب اشارہ نہ کیا جائے، اور ایسی اغراض کا تذکرہ نہ کیا جائے جن کا حصول تقریباً نا ممکن ہو۔ ناممکن الحصول ہدف والے مقالے قابل اشاعت نہیں ہوتے۔ ایسے اہداف والی تحقیق کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی ہے۔

(۸) موضوع پر تحقیق کا منہج

تحقیق طلب موضوع چاہے نظری نوعیت کا ہو چاہے تجربی اور اِطلاقی نوعیت کا اس پر کام کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مناسب منہج اور طریقہ تحقیق ضرور ہوتا ہے۔ مشہور مناہج میں منہج استقرائی، استنباطی، تقابلی، کلامی، جدلی، تجزیاتی و تنقیدی، تاریخی، وصفی، وغیرہ شامل ہیں۔ مقالہ نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے مقالے کے لیے ایسے منہج یا طریقہ تحقیق کی وضاحت کرے جو اس موضوع کے مناسبِ حال ہو۔ عنوان کی عبارت میں 'تحقیقی جائزہ' لکھ دینا کافی نہیں ہوتا کیونکہ 'تحقیقی جائزہ' کسی منہج کا نام نہیں ہے۔ مقالہ نگار کو اس طریقہ کی وضاحت کرنی چاہیے جس سے اُس کی تحقیق کے بنیادی سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔ بعض موضوعات ایسے ہوتے ہیں جن کے سوالات کے جوابات تک پہنچنے کے لیے ایک سے زائد مناہج کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقالہ نگار کو اس نکتے پر ضرور اظہار خیال کرنا چاہیے۔ قابل اشاعت سمجھے جانے والے مقالہ کی یہ علمی خوبی ہوتی ہے کہ اس کا مصنف ابتداء ہی میں اپنے معقول منہجی اور منطقی طرزِ استدلال کی توضیح کرتا اور آخر تک اُس کی پیروی کرتا ہے۔ اِس لیے مقالہ نگار علوم اسلامیہ میں استعمال ہونے والے مختلف مناہج اور طرق بحث کی گہری معرفت حاصل کرے۔ اور اپنے منتخب موضوع پر تحقیق کے لیے بہترین اور انسب منہج کو اختیار اور استعمال کرے۔

منہج کے حوالے سے ڈاکٹر محمد سجاد نے ایک بڑی ضروری، مفید اور پتے کی بات بتائی ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر تفسیر قرآن مجید کے متعلق موضوع ہے تو تفسیر کا منہج اِختیار کیا جائے، اگر موضوع کا تعلق حدیث اور علوم حدیث سے ہے تو حدیث کا منہج اختیار کیا جائے۔ عموماً مقالہ نگار کچا پکا کام کرتے ہیں۔ عنوان بہت عمدہ ہوتا ہے مگر مواد جہاں سے بھی ملا، جس طرح کا ملا، جس سطح کا ملا جمع کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں جمع بھی چلیں ٹھیک ہے لیکن جمع کرنے کے بعد کوئی منہج تو اختیار کر لیں۔ یہ بڑی ضروری بات ہے کہ جو متقدمین ہیں پہلے ان کے موقف اور رائے کو آنا چاہیے، پھر جو متاخرین ہیں ان کی رائے اور موقف لانا

چاہیے اور اِن کے بعد جو جدید نقطۂ نظر ہے اُسے پیش کیا جانا چاہیے۔ لیکن لکھتے کیا ہیں کہ علامہ قرطبی نے یہ لکھا ہے، ابن کثیر نے یہ لکھا ہے اور درمیان میں علامہ سید مودودی نے یہ بات کہی ہے، علامہ ابن تیمیہ نے یہ بات لکھی ہے، مولانا فراہی نے یہ کہی ہے، اب کوئی ترتیب ہی نہیں ہے۔ کوئی منطقی، کوئی تاریخی، کوئی زمانی، کوئی سبجیکٹ کی تقسیم۔ [23]

ڈاکٹر محمد سجاد نے بالکل درست فرمایا ہے۔ جو اُصولی نکات انہوں نے بیان کیے ہیں ان کا لحاظ نہ رکھا جائے مقالہ ادھر ادھر سے جمع کردہ مواد کا ایک ملغوبہ تو ہو سکتا ہے ایک منفعت بخش تحقیق بالکل نہیں۔ یہاں تک اُن عناصر کی توضیح اور تشریح پیش کی گئی ہے اور اُن کے تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جنھیں ایک مقالہ نگار اپنے مقالہ کے ابتدائی ڈیڑھ دو صفحات پر پھیلے مقدمہ میں بالاختصار بیان کرتا ہے۔ ان کے بعد مقالے کا دوسرا بڑا حصہ شروع ہوتا ہے جسے صُلبِ موضوع کہا جاتا ہے۔ اب صُلبِ موضوع کے اجزاء اور انہیں لکھنے کے تقاضے ملاحظہ فرمائیں۔

5. صُلبِ موضوع اور اُس کے عناصر ترکیبی

صُلبِ موضوع سے مراد منتخب موضوع کی مرکزی بحث ہے۔ اِسی کے لیے موضوع منتخب کیا جاتا ہے اور اسی میں محقق کی شخصیت، کاوش اور موقف کے اصل خد وخال سامنے آتے ہیں۔ یہ مرکزی بحث مختلف عناصر ترکیبی سے تشکیل پاتی ہے۔ یہاں مقالہ نگار کو جن اُمور کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے اُن میں یہ نو بہت اہم ہیں: (۱) مباحث و مطالب کی تقسیم کا خاکہ، (۲) پیراگرافوں اور اقتباسات میں ربط، (۳) احادیث کے اقتباسات اور اُن پر حکم، (۴) اِملاء، رسم الخط اور رموزِ اوقاف، (۵) تحقیقی مقالے کی زبان اور اُسلوب، (۶) صِحت متن، (۷) رَسمیاتِ مقالہ، (۸) مقالے میں مذکور شخصیات کے تراجم، اور (۹) اخلاقیاتِ تحقیق۔ اِن کے تقاضے اور لکھنے کے مناسب طریقے درج ذیل میں ملاحظہ کریں۔

(۱) مباحث و مطالب میں مقالہ کی تقسیم اور خاکہ

مقدمہ کے بعد اور صُلبِ موضوع سے پہلے موضوع کا خاکہ (Outline) دینا چاہیے۔ خاکے کا فقدان ایک ایسی عام کمزوری ہے جو اکثر مقالات میں پائی جاتی ہے۔ کسی بھی تحقیق طلب موضوع کے متعدد پہلو ضرور ہوتے ہیں۔ انہی مختلف جوانب کی وجہ سے وہ مقالہ مباحث، مطالب یا نکات میں تقسیم ہوتا ہے۔ مقالہ نگار کو چاہیے کہ وہ صُلبِ موضوع اور اپنے مقالہ کے مرکزی حصّے کو شروع کرنے سے پہلے ایک یا آدھے صفحہ پر مقالے کے مندرجات کا خاکہ لکھے۔ اس تقسیم کی مدد سے جہاں ایک طرف مقالہ نگار کو اپنی تحقیق کے متعدد پہلوؤں اور مختلف جوانب کو معقول علمی ترتیب اور ربط سے پیش کرنے میں آسانی ہوتی ہے وہاں اس تحقیق کا مطالعہ کرنے والے کسی قاری کو مقالہ نگار کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بھی بہت آسانی ہوتی ہے۔ اس طریقہ سے ایک طرف مصنف کو اپنا مافی الضمیر اور تحقیق پیش کرنے میں آسانی ہوتی ہے تو دوسری طرف قارئین کو اُس تحقیق کی کڑیوں کو جاننے اور اُن کے ذریعے دیئے گئے پیغام کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ اس لیے مقالہ نگار کو چاہیے کہ اپنے کام کی ساخت اور ترکیب ایسی بنائے کہ اس کا مقالہ قابل اشاعت مقالات میں شامل ہو جائے۔ اس کا ایک نمونہ زیر نظر آرٹیکل کے شروع میں بھی پیش کیا گیا ہے۔

تحقیقی مقالات میں بحث کے خاکہ کے عدم وجود پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد سجاد کہتے ہیں کہ انگریزی اور عربی میں لکھنے والے اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ پورا خاکہ پہلے بیان کر دیتے ہیں۔ مقالے کا عنوان یہ ہے، منہج یہ ہے، اہداف یہ ہیں اور اس کی تقسیم یہ ہے۔ اتنی فصول ہیں، اتنے مباحث اور اتنے مطالب ہیں۔ مقالہ نگار پہلے ایک دو صفحوں کے اندر پورا خاکہ بیان کر دیتا

ہے۔ پھر ترتیب سے ہر چیز کو مقالے میں زیر بحث لاتا ہے۔ اردو میں اس کی کوئی روایت نہیں۔ حالانکہ ایسا ہونا چاہیے تاکہ پتا چلے کہ لکھنے والے نے کاپی پیسٹ نہیں کیا بلکہ اپنا input اس کے اندر دیا ہے۔ یہ بہت مفید چیز ہے کیونکہ اس سے مقالہ نگار مقالے کو جتنا تقسیم در تقسیم کرے گا اتنا اُس کا Vision کھل کر، صاف اور واضح انداز میں پیش ہو گا۔ اگر وہ صرف سیدھے سیدھے پیراگراف لکھتا جائے گا تو یہ بہت مشکل پیدا کریں گے۔ پڑھنے والے کے پاس بھی اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ رُک رُک کر مقالے کے اندر مقالہ نگار کی فلاسفی کو سمجھے۔ اس لیے عربی اور انگریزی مقالات میں بہت اہتمام ہوتا ہے۔ یہ ہم نے دیکھا ہے لیکن اردو میں تو آج تک دو چار دوستوں کے علاوہ ہم نے کسی کا ایسا مقالہ نہیں دیکھا جس میں وہ پورا خاکہ discuss اور بیان کرتے ہوں۔[24]

(۲) پیراگرافوں اور اقتباسات میں ربط

یہ صُلبِ موضوع کا سب سے اہم عنصر ہے۔ مقالہ نگار کو چاہیے کہ موضوع کے متعلق اپنے افکار کی کڑیوں کو بیان کرنے والے مختلف پیراگرافوں میں گہرا ربط پیدا کرے۔ اس کی کمی عموماً وہاں زیادہ محسوس ہوتی ہے جہاں اقتباسات ہوتے ہیں۔ ربط پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اقتباس لانے سے پہلے اقتباس کے لیے دو تین تعارفی جملے لکھے جائیں۔ پھر اقتباسات پر تعقیب یا تبصرہ بھی لازماً ہو۔ اقتباسات کا تجزیہ و تحلیل کرکے اُن کی وجہ استدلال بیان کی جائے کہ نقل کردہ اقتباس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ کس چیز کی نفی ہوتی ہے؟ کس موقف کا ردّ ہوتا ہے؟ اس میں پیش کیے گئے افکار دُرست ہیں یا غلط، مفید ہیں یا غیر مفید، وغیرہ۔ اقتباسات در اصل محقق کے موقف کی سچائی کو ثابت کرنے والے شواہد ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا مستند، معتبر، معقول، مناسب اور نپاتُلا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اقتباس میں اگر قرآنی آیات ہیں تو اُن کی صحت کا سو فیصد یقین کر لینا محقق کے لیے اوّلین درجے کی ذمہ داری ہے۔ اقتباس اگر کسی عربی، انگریزی یا فارسی متن کا ترجمہ ہے تو مقالہ نگار کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خود ترجمہ کا ناقدانہ جائزہ لے۔ وہ اِس بات کو یقینی بنائے کہ ترجمہ اصل متن کے پیغام اور اُس کی روح کی بالکل دُرست نمائندگی کر رہا ہے۔ اِن جگہوں پر محقق کی شخصیت واضح طور پر متحرک اور فعال نظر آنی چاہیئے۔ اسی طرح پیراگرافوں میں بیان کردہ نکات کو باہم مربوط کرنے کے لیے بھی کچھ جملے لکھنے چاہئیں۔ مقالہ کی تیاری کے وقت اس خامی کو ہر حال میں دور کرنا بہت ضروری ہے۔

اقتباسات اور عبارات میں ربط کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد سجاد کہتے ہیں کہ اکثر مقالہ نگار ہر قسم کا مواد جمع کرکے ایک ملغوبہ سا بنا دیتے ہیں۔ وہ کوئی نتائج نہیں نکالتے اور نتائج نکالنے کا کام قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یعنی جو اقتباسات جمع کر دیے ہیں اُن میں ربط نہیں ہے۔ کیوں اقتباس لیا ہے؟ یہاں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ اس سے نتائج کیا نکالے ہیں؟ ایک اقتباس، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا! اقتباسات کی بھرمار ہوتی ہے اور ان میں تجزیہ نہیں ہوتا اس سے نتائج نہیں نکالے جاتے۔ اس سے مقالے کے مرکزی موضوع کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہوتا۔[25]

ڈاکٹر صاحب نے اس وضاحت میں جن مرکزی خامیوں اور کمزوریوں کا تذکرہ کیا ہے وہ بہت توجہ طلب ہیں۔ نوآموز اور مبتدی مقالہ نگاروں کو چاہیے وہ انہیں سمجھیں اور آئندہ اپنے مقالات میں سیکھے ہوئے سبق کو استعمال کریں تاکہ ان کے مقالات قابل اشاعت کی فہرست میں آسانی سے شامل ہو سکیں۔

(۳) احادیث کے اقتباسات اور اُن پر حکم

حدیث کیونکہ علوم اسلامیہ کے بنیادی مصادر میں سے دوسرے درجے پر ہے اس لیے حدیث کی نقل، اِس کے اعراب اور اس پر محدثین کے حکم کو بیان کرنے میں بھی خاص اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر مروجہ صورت حال کیا ہے؟ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد سجاد نے اپنے طویل تجربات کی روشنی میں مقالہ نگاروں کے رویے پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ ہمارے مقالہ نگاروں کی سب سے زیادہ سُستی یا کمزوری کا جو عمل دیکھنے میں آتا ہے وہ حدیث کے متعلق ہے۔ جہاں تک صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا تعلق ہے تو اُن کا معاملہ دوسری کُتبِ حدیث سے مختلف ہے۔ اگر مقالہ میں کوئی حدیث صحیحین سے آجاتی ہے تو اس میں چلیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس پر کلام نہیں، سِوائے چند احادیث کے۔ لیکن اس کے علاوہ تمام مصادرِ حدیث سے لی جانے والی حدیث پر حکم لگانا ضروری ہوتا ہے۔ مقالہ نگاروں کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ حدیث نقل کردیتے ہیں مگر اس پر حکم کی کوئی بات نہیں کرتے۔ یہ حدیث کس درجے کی ہے؟ اس سوال کا جواب دینا اور اس حدیث کی مکمل تخریج کرنا بہت ضروری اور مطلوب عنصر ہے۔ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ اُن ساری کتابوں کے نام لکھ دیئے جائیں جہاں سے حدیث آئی ہے بلکہ یہ بتایا جائے کہ اس پر محدثین کا حکم کیا لگا ہے؟ یہ کتنی معتبر حدیث ہے؟ یہ مشہور ہے، عزیز ہے، غریب ہے؟ اس میں کہیں کوئی ایسا پہلو ہو تو حواشی میں تخریج کے اندر آجانا چاہیے تاکہ آپ جن احادیث کو نقل کررہے ہیں اُن کی استنادی حیثیت اور مقام و مرتبہ معلوم ہو جائے۔[26]

انٹرویو کے دوران جب میں نے ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا کہ حدیث پر حکم لگانا تو عام مقالہ نگاروں کے لیے ممکن نہیں ہے بالخصوص وہ جنہیں حدیث کے میدان میں تخصص کا درجہ حاصل نہیں ہے تو اُن کے لیے کوئی ایسی کتاب، کوئی ایسا طریقہ بتا دیں جو انہیں اس سلسلے میں کام دے سکے، تو انہوں نے کہا کہ صحیحین سے لی جانے والی حدیث کا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی بات ہم پہلے کر آئے ہیں۔ صحاح ستہ کی باقی کتابوں میں ایک جامع ترمذی ہے۔ اس میں امام ترمذی خود بتاتے ہیں کہ حدیث کس درجے کی ہے۔ صحیح ہے، حسن ہے، غریب ہے۔ پھر سُنن کی جو کتابیں ہیں یعنی سُنن ابن ماجہ، سُنن ابی داوٗد، سُنن نسائی ان کے بارے میں شیخ احمد شاکر سے لے کر شیخ ناصر البانی تک کی تحقیقات موجود ہیں۔ اس سے مقالہ نگار فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کثرتِ طرق سے کوئی حدیث اور جگہ سے بھی مل جاتی ہے تو اس جگہ حکم بھی موجود ہوتا ہے۔ آپ آج سند بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے سوفٹ ویئر موجود ہیں جن کی مدد سے آپ خود بھی رائے قائم کر سکتے ہیں کہ یہ حدیث کس درجے کی ہے؟[27]

(۴) اِملاء، رسم الخط اور رموزِ اوقاف

کسی بھی تحریر کی بہتر تفہیم کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ مقالہ نگار اِملاء، رسم الخط، رُموزِ اَوقاف اور رسمیات کا پورا لحاظ رکھے۔ بہتر ہوتا ہے کہ مقالے میں قرآنی آیات کا خط، عربی عبارات کا خط، فارسی اقتباسات کا خط اور اردو متن کا خط مختلف ہوں۔ راقم الحروف کے نزدیک آیاتِ قرآنی کے لیے المصحف یا محمدی فونٹ کا استعمال کرنا بہتر ہے۔ آیت کے کلمات کے ارد گرد پھول دار چھوٹی بریکٹ استعمال کی جائے۔ عربی عبارات کے لیے ٹراڈیشنل عریبک کا فونٹ اختیار کیا جائے۔ اسی طرح فارسی زبان کے اقتباسات کے لیے جو فونٹ ان کے مناسب ہو اور اردو کے لیے جمیل نوری نستعلیق فونٹ کو ترجیح دی جائے۔ اس کے ساتھ متن میں اُردو رُموزِ اوقاف کے انتخاب اور مناسب استعمال کو مطلوبہ معیار تک برقرار رکھا جائے۔ سکتہ (،)، رابطہ (:)، وقفہ (؛)، قوسین () یا []، خط یا ڈیش (۔)، نقطے (...)، لفظی اقتباس کے لیے واوین ("")، وغیرہ کا درست استعمال کرے۔

زبان اور رموزِ اوقاف کے حوالے سے جو بڑے مسائل ایک جائزہ کار کو مقالات میں ملتے ہیں اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد سجاد کہتے ہیں کہ فقرے بہت لمبے اور طویل ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ پورا پیراگراف بلکہ پورا صفحہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کہیں فل اسٹاپ یا کامہ بالکل نہیں ہوتا۔ بات ختم ہوتی ہے 'اور' شروع ہو جاتا ہے، 'اور' ختم ہوتا ہے، 'چونکہ' شروع ہو جاتا ہے، 'چونکہ' ختم ہوتا ہے تو 'چنانچہ' آ جاتا ہے۔ یعنی وہ کہیں رُکتے ہی نہیں ہیں۔ مقالہ نگار اپنی بات میں سانس ہی نہیں لیتا۔ اس کی پوری عبارت میں معقول اور مناسب ربط نہیں ہوتا۔ اسی طرح تدوین کے مراحل اور مسائل ہیں۔ تدوینِ مقالات میں مقالہ نگار جو کر لیتا ہے مدیر بھی اس کو ویسے کا ویسے لے لیتا ہے چونکہ اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ مقالہ نگار مقالہ کمپوز کر کے، خود سیٹ کر کے اور اپنے طور پر بنا سنوار کر بھیجتے ہیں۔ مدیر کے پاس اگرچہ وقت کی کمی اور تنگی ہوتی ہے لیکن مدیر کو بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ زبان بہتر کرے، مناسب تدوین کرے، وہ اس میں غیر مناسب الفاظ اور غیر علمی عبارات کو نکال دے یا انہیں بہتر کر دے۔[28]

اس سلسلے میں مقالہ نگاروں کے لیے رشید حسن خان کی کتاب "اردو اِملا" اور اعجاز راہی کی کتاب "اِملاء و رموز اوقاف کے مسائل" کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہو گا۔[29] کچھ اضافوں اور مناسب ترمیم کے ساتھ یہ بحث ڈاکٹر عبد الحمید عباسی کی کتاب "اُصول تحقیق" میں بھی ملتی ہے۔[30] اُردو زبان میں علوم اسلامیہ سے متعلق مقالہ لکھنے والے اِس کے باب ۱۳ اور ۱۴ کا مطالعہ ضرور کریں۔ اسی جگہ ایک اور بات کا دھیان رکھنا بھی مقالہ نگار کے لیے ضروری ہے اور وہ ہے زبر زیر پیش کا استعمال۔ جہاں کہیں خدشہ ہو کہ قاری کو کسی لفظ کا درست تلفظ معلوم نہیں ہو گا وہاں زبر، زیر، پیش، شدّ مد وغیرہ لکھ دینا چاہیئے۔[31] کوئی ایسا لفظ یا اِصطلاح متن میں آ جائے جس کے بارے میں گمان غالب ہو کہ قارئین کو اس کا مفہوم معلوم نہیں ہو گا تو حاشیے میں اس کی توضیح کر دینی چاہیے تاکہ اس کی تحریر کا معیار بلند رہے اور ابلاغ میں کسی قسم کی رُکاوٹ باقی نہ رہے۔

(۵) تحقیقی مقالے کی زبان اور اُسلوب

ایک قاری کو جو تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں ان کی زبان اور اُسلوب خطیبانہ، پُر آرائش، مبالغہ آمیز، لفاظی سے بھرپور، تناقض و تضاد کے عناصر پر مشتمل، ضعفِ استدلال، شاعرانہ رنگین بیانی والا، وغیرہ ہو سکتا ہے۔ مگر ایک تحقیقی مقالے کی زبان اور اُسلوب کیسا ہونا چاہیئے؟ پختہ مزاج محققین کے نزدیک مقالہ کی زبان عامیانہ اور بازاری نہیں ہونی چاہیئے۔ مقالے کا اُسلوب نگارش خطیبانہ انداز اور تناقض و تضاد سے پاک ہونا چاہیئے۔ استدلال میں کمزوری نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے معروف محقق عبد الرزاق قریشی کی ایک قابل قدر بات نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "تحقیقی مقالہ چونکہ واقعات وحقائق پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس میں لفاظی یا افسانہ طرازی، خطابات یا شاعرانہ رنگین بیانی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ یہ باتیں مقالے کی عظمت کو کم کرتی ہیں۔"[32] نثار احمد قریشی بھی اسی بات کی تائید میں لکھتے ہیں: "کسی بھی تحقیقی کارنامے میں زبان اور اُسلوبِ بیان کی اہمیت بنیادی اور اساسی ہے اور اُسے نظر انداز کرنے سے تحقیق اپنے مقام و مرتبے سے گر جاتی ہے۔"[33]

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں ایک جگہ حکم دیا ہے:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ، وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ[34]۔

ترجمہ: اپنے رب کے راستہ کی طرف بلائیے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور اُن پر حجت قائم کیجئے احسن طریقہ سے، بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے راہ پانے والوں کو۔ اور اگر تم اُنہیں سزا دو تو ایسی ہی سزا جیسی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی، اور اگر تم صبر کرو تو بے شک صبر بہت اچھا ہے صبر کرنے والوں کے لیے۔ [35]

اسی آیت مبارکہ کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر قاضی عبد القادر لکھتے ہیں:

"یہی ہمارا اُصول شائستگی ہے جس کا مقصد تحریر و تقریر میں اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ ایسے الفاظ سے پرہیز کیا جائے جس سے سُننے والے اور پڑھنے والے کی دل آزاری ہو سکتی ہو۔ گفتگو اس انداز میں ہو کہ بات کہنے اور سُننے والے کے درمیان دُوری کا اِمکان نہ رہے۔ اگر فاصلے ہیں تو کم ہو جائیں۔ کسی کی تضحیک نہ ہو اور استہزا کا رنگ نہ آئے۔ اس طرف منطق بھی توجہ دلاتے ہیں کہ اپنی بات قبول کرانے کے لئے اپنی دلیل میں دوسروں کو نشانہ نہ بنائیں۔ نہ اپنی مظلومیت کا مظاہرہ کرکے بات منوانے کی کوشش کی جائے۔" [36]

اپنے اس بیان میں ڈاکٹر قاضی عبد القادر نے بہت خوبصورت بات کی ہے۔ اس میں انہوں نے مؤثر تحریر کی خوبیاں اور مقالہ نگار کی بہترین فکر کی وضاحت کی ہے۔ اسی سوچ کو قدرے سادہ انداز میں مگر بعض ضروری اُمور کا اضافے کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی کہتے ہیں کہ اتنی بات کافی نہیں ہے کہ مقالہ کا موضوع بہت اچھا ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اُسے کس انداز میں پیش کیا گیا ہے؟ مثلاً قرآن کی دعوت کے جو اُصول ہیں اُن میں ہمیں نظر آتا ہے کہ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی جو بات ہے وہ وزنی ہو لیکن بات کا صرف وزنی ہونا کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ بات آپ احسن طریقے سے کریں۔ یعنی آپ کا اپنی تحقیق کو پیش کرنے کا انداز بھی بہت اچھا ہو۔ تحقیق کے جو تقاضے ہیں، جو اسلوب ہیں، جو انداز ہے، جو آداب ہیں، گفتگو کرنے کا جو سلیقہ ہے ان تمام چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔ اُسلوب کے حوالے سے ایک اور اہم بات یہ ہے کہ آپ پہلے اپنے مخاطبین اور قارئین متعین کر لیتے ہیں کہ وہ کون ہیں؟ جن لوگوں کی طرف آپ کا روئے سُخن ہے وہ اگر ایک علمی حلقہ ہے تو آپ کا اسلوب تھوڑا علمی ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کے مخاطبین عوام الناس ہیں تو آپ کا اسلوب زیادہ سلیس اور سادہ ہونا چاہیے۔ یہ چیزیں موقع محل اور موضوع کی مناسبت سے دیکھی جاتی ہیں۔ [37]

اِن دونوں محققین کی باتوں میں مقالہ کی زبان اور اُسلوب کے حوالے سے بہت عمدہ نکات سامنے آگئے ہیں۔ نو آموز مقالہ نگار ان پر عمل کرنے سے اپنے مقالے کو جاندار بنا سکتے ہیں۔ چونکہ انہیں اپنی تحقیق کے نتائج اپنے قارئین تک پہنچانا ہوتے ہیں اس لئے یہ بات مدِ نظر رکھنی چاہیئے کہ اِبلاغ ہو جائے۔ ابلاغ کے لیے ضروری ہے کہ مقالہ نگار کے الفاظ اور جملے اپنے قاری کو مسلسل اپنی جانب متوجہ رکھیں۔ ایسا اُس صورت میں ممکن ہوتا ہے جب الفاظ اور جملوں کی ترتیب اور بناوٹ میں کوئی خلل نہ ہو۔ اجزائے کلام یعنی اسمائے اشارات، ضمائر، فاعل، اَفعال، مفعول، حروف عطف، اضافتیں، مترادفات، مرکبات توصیفی، مرکبات اضافی، وغیرہ سب اپنے درست مقام پر لکھے جائیں۔ اِن سب کے استعمال میں واحد جمع اور مذکر مؤنث کی دُرستی کا پورا خیال رکھا جائے۔ جملوں کی اقسام پر پوری توجہ رہے۔ دیکھا جائے کہ جملہ خبریہ، جملہ انشائیہ، جملہ سوالیہ، جملہ استعجابیہ، وغیرہ اپنے لوازمات کے ساتھ بر محل استعمال ہوئے ہیں۔ اِن جملوں میں جن شخصیات کا ذکر ہو اُن کے علمی مقام، قومی و دینی خدمات، ملی کردار وغیرہ کا مناسب القابات سے اظہار کیا جائے۔

اِس لیے مقالہ نگار بار بار خود سے پوچھے کہ جن الفاظ وتراکیب کا اس نے چناؤ کیا ہے اور جملوں کی جو ساخت اس نے اختیار کی ہے کیا اُن سے اس کی تحقیق کا پیغام قارئین تک پہنچ جائے گا؟ کیا اس مثبت پیغام سے تعمیری نتائج اور مطلوب اثرات کی قوی امید لگائی جا سکتی ہے؟ ان سوالات کے پیشِ نظر جہاں محسوس ہو اُسے اپنے الفاظ، اصطلاحات، تراکیب، اور جملوں کی ساخت میں مطلوبہ اصلاح اور ترمیم کرنا چاہیئے اور کوئی رخنہ باقی نہ رہنے دیا جائے۔ اس سے مقالہ کی اشاعت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

(۶) **صحتِ متن**

مقالے کی کمپیوٹر کمپوزنگ میں کئی طرح کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً کسی لفظ کا آخری حرف اگلے لفظ کے پہلے حرف سے جڑ جاتا ہے؛ کسی لفظ کا دوسرا جز یا آخری حرف اگلی سطر میں چلا جاتا ہے؛ ح کو ھ اور ذ کو ز لکھ دیا جاتا ہے؛ بعض اوقات کاپی پیسٹ کرتے وقت ضرورت سے کم یا زیادہ متن کاپی پیسٹ ہو جاتا ہے۔ اِن تمام غلطیوں سے مقالہ کو پاک اور صاف ہونا چاہیئے۔ مزید برآں، الفاظ کے درمیان فاصلہ دُرست اور پیراگرافوں کی لمبائی میں توازن ہونا چاہیئے۔ ہر پیراگراف کی پہلی سطر کو مناسب فاصلہ یا ایک ٹیب (tab) دے کر لکھنا چاہیئے اور ایسا ہر پیراگراف کی پہلی سطر کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ جہاں مختلف نکات بیان کرنا ہوں وہاں اعداد کا استعمال ضرور کرنا چاہیئے۔ ہر ممکن کوشش کی جائے کہ ایسی تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں جو مقالے کے پیغام کو قارئین تک پہنچانے میں حائل ہو سکتی ہیں۔

(۷) **رسمیاتِ مقالہ**

رسمیاتِ مقالہ سے یہاں اَیسے اُصول و ضوابط مراد ہیں جن کا محققین کے ہاں رواج بن چکا ہے، جو تحقیقی اداروں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کا تعلق معلومات سے ہے۔ یہ کہاں سے، کیسے، کونسی اور کتنی اخذ کی جائیں گی؟ ان میں سے کونسی معلومات مقالات میں پیش کرنا ضروری سمجھی جاتی ہیں؟ انہیں پیش کرنے کا طریقہ اور ترتیب کیا ہے؟ وغیرہ۔

جب ایک محقق تحقیقی موضوع پر کام کرنا شروع کرتا ہے تو اسے جو مواد ملتا ہے اس کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک جلد پر مشتمل کتاب، ایک سے زیادہ جلدوں پر مشتمل کتاب، کئی جلدوں پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا، تحقیقی مجلّہ میں شائع شدہ مقالہ، اخبار، ماہنامہ رسالہ، سہ ماہی جریدہ، شش ماہی مجلّہ، سالنامہ، انٹرویو، سوالنامہ، ٹی وی یا ریڈیو پر نشر ہونے والا مباحثہ، خط، مسوّدہ یا مخطوطہ، وغیرہ۔ اسی طرح ان میں سے کسی بھی ماخذ کا ایک مصنف، مؤلف، مرتب، ایڈیٹر، مترجم بھی ہو سکتا ہے اور ایک سے زیادہ بھی۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی محقق کو ایک ماخذ سے ایک یا زائد اقتباسات کی ضرورت محسوس ہو۔ اقتباسات کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ متن کے کسی لفظ یا اصطلاح کی وضاحت کے لیے حاشیے یا تعلیق کی ضرورت ہو۔ اِن تمام معاملات کے اپنے اپنے تقاضے ہیں جنہیں پورا کرنا لازم ہوتا ہے۔ مزید برآں مقالہ نگار کو زیرِ صفحہ یا مقالہ کے آخر میں حوالے پیش کرنا ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حوالہ، حاشیہ، تعلیق وغیرہ میں کن کن معلومات کو پیش کرنا لازم ہوتا ہے اور یہ کہ ان معلومات کی ترتیب میں کن تقاضوں کو پورا کرنا تحقیقی کام کا ناگزیر حصہ ہوتا ہے۔

یہ بہت اہم امور ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مقالہ نگاران اُن کتب کی طرف رجوع فرمائیں جن میں ان امور پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔[38] علوم اسلامیہ کے متعلق مقالہ لکھنے والے نوآموز تحقیق کاروں کے لیے ڈاکٹر عبدالحمید عباسی کی کتاب ''اصول تحقیق'' کے باب ۱۵ اور ۱۶ کا مطالعہ بہت فائدہ دے گا۔[39]

پورے مقالہ میں مقالہ نگار ضروری جگہوں پر حاشیے لکھے۔ تعلیقات سے اپنی گفتگو کو واضح اور پختہ بنائے۔ اقتباسات کی صحت کا مکمل خیال رکھے۔ لفظی اقتباس مصدر کی چھ سطروں سے زائد نہ ہو۔ حوالہ جات میں ہر اقتباس کی سند یعنی مصدر و مرجع کی مکمل معلومات رائج طریقے اور ترتیب سے پیش کرے۔ قرآن مجید کی آیات کے حوالے درست دے اور آیات پر زبر زیر پیش وغیرہ حرکات بھی درست لگائے۔ حدیث کے متن کی دُرستی کا یقین کیا کرے۔ حدیث کا حوالہ تخریج حدیث کے اُصولوں کے مطابق پیش کرے۔ باقی مصادر و مراجع کی معلومات میں بھی کسی غلطی اور خطا کا شکار نہ ہو۔ فُٹ نوٹس یا اختتامی نوٹس میں حوالہ کے پورے عناصر متداول ترتیب سے ذکر کرے۔ مزید برآں ، جیسے انگریزی زبان کی کتاب کا نام ، حوالہ اور اس کی متعلقہ معلومات کو انگریزی حروف اور خط میں لکھا جاتا ہے اسی طرح عربی زبان کی کتاب اور اس کی متعلقہ معلومات کو بھی عربی رسم الخط (فونٹ) میں لکھنا چاہیئے۔ یہی طریقہ اُردو زبان کے مصادر و مراجع کی معلومات درج کرنے میں بھی اختیار کرنا چاہیئے۔

(۸) مقالے میں مذکور شخصیات کا علمی تعارف

مقالہ میں جن شخصیات کے نام متن یا حاشیہ میں وارد ہوں مقالہ نگار اُن میں سے ہر ایک کے سنہ پیدائش و وفات یا دونوں میں سے جو دستیاب ہو پوری ذمہ داری کے ساتھ دُرست لکھے۔ ہجری سنہ اور اس کے مطابق عیسوی سنہ بھی لکھے۔ اُن میں سے ہر ایک کے لیے بھی تعارفی جملے لکھے۔ اُن کی وجہ شہرت اور اہمیت ضرور بیان کرے۔ اس چیز کو عربی محققین شخصیات کے تراجم کہتے ہیں۔ اُردو زبان میں لکھے جانے والے مقالات میں بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر محمد سجاد تراجم کے سلسلے میں پائی جانے والی کمزوری اور کوتاہی پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے مقالوں میں آج تک اِکا دُکا کوئی مقالہ ہوگا جو ایچ ای سی کے ریسرچ جرنل میں ہم نے دیکھا ہو کہ اس پورے مقالے میں جتنے اعلام آئے ہیں جتنی شخصیات آئی ہیں ان کا ترجمہ دیا گیا ہو۔ عربی اور انگریزی مجلات کے اندر لوگ اہتمام کرتے ہیں لیکن اردو کے مقالات کے اندر نہیں کیا جاتا۔ پی ایچ ڈی یا ایم فل کے مقالات میں تو کچھ کرتے ہیں لیکن ریسرچ جرنل میں جو مقالے چھپتے ہیں ان میں تراجم کا تو بالکل اہتمام نہیں ہوتا۔ اس کے بغیر ہی تحقیق پیش کی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی کمزوری ہے مقالہ نگاروں کو چاہیے کہ وہ تراجم اعلام کا خاص اہتمام کیا کریں۔[40]

(۹) اخلاقیاتِ تحقیق

اخلاقیاتِ تحقیق میں بہت زیادہ باتیں شامل ہیں۔ اُن کی تفصیل بہت طویل ہے۔ اس لیے یہاں ہم اُن چند ایک کا ذکر کرتے ہیں جن کا ایک ریسرچ پیپر سے گہرا تعلق ہے:

ا۔ مقالہ نگار کو امانت و صداقت کی صفات سے متصف ہونا چاہیے۔ جو جو عبارات وہ کسی مصنف کی تحریر سے لے اُن سب کا امانت و صداقت کے ساتھ حوالہ پیش کرے۔ سرقہ بازی سے مکمل اجتناب کرے۔[41] اگر کسی ایسی عبارت کا اقتباس پیش کیا ہے جسے اس کے مصنف کی اصل کتاب سے نہیں بلکہ کسی اور مصنف کی کتاب سے نقل کر رہا ہے تو دونوں کا ذکر کرے۔ دونوں کی کتابوں کا مکمل حوالہ دے۔

ب۔ مقالے میں مذکور محترم و مکرم شخصیات کے ناموں کے ساتھ حسبِ موقع علیہ السلام، ﷺ، رضی اللہ عنہ، علیہ الرحمۃ، رحمۃ اللہ علیہ، وغیرہ احترامی دُعائیہ کلمات لکھے۔ اللہ تعالیٰ لکھے صِرف اللہ نہ لکھے، قرآن مجید یا قرآن کریم لکھے صِرف قرآن نہ لکھے۔ جو حضرات اپنے اپنے علم و فن میں امام مانے جاتے ہیں اُن کا نام لکھتے وقت 'حضرت، امام' ضرور لکھے۔

امام ابو بکر بیہقی (م ۴۵۸ ھ) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نبی کریم ﷺ کا ایک ارشاد گرامی نقل کیا ہے: ''لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا وَيَعْرِفُ حَقَّ صَغِيرَنَا وَيَأْمُرُ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ''[42]۔ یعنی وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے بڑوں کی تعظیم و توقیر نہیں کرتا، اور ہمارے چھوٹوں کے حق کو نہیں پہچانتا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتا۔ اس حدیث نبوی کو مد نظر رکھ کر اُسلوب کلام اختیار کرنا چاہیے۔

ج۔ مقالہ نگار اگر اپنے مقالے میں عربی، انگریزی یا فارسی کے اقتباسات پیش کرتا ہے تو اُسے چاہیے کہ اُن کا اُردو ترجمہ بھی دِقت نظر اور مکمل دُرستی کے ساتھ لکھے تاکہ ماہر مضمون کو معلوم ہو سکے کہ مقالہ نگار جو اقتباسات پیش کر رہا ہے وہ اُنہیں اچھی طرح سمجھتا بھی ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ بحث کے نتائج کے درست طور پر اخذ کیے جانے کا علم ہو سکے۔

د۔ مقالے کی زبان موضوع اور مُخاطبین کی سطح کے مناسب ہو۔ کہیں بھی کوئی جملہ غیر عالمانہ یا غیر سنجیدہ نہ ہو۔ کسی کے موقف، خیال یا رائے پر ایسا کوئی دعوی یا ایسی تنقید نہ کرے جو کسی انسانی ذریعے اور تحقیقی طریقے سے معلوم نہ ہو سکتی ہو۔ کسی سے اختلاف کرے تو الفاظ و انداز ایسا ہو کہ مُخالف اس کے موقف اور رائے کو قبول کرنے میں کشش اور آسانی محسوس کرے۔ ایسا نہ کہ مقالہ نگار کا دُرشت رویہ، سخت الفاظ اور نفرت انگیز اُسلوب قاری کو مقالہ نگار کا موقف قبول کرنے سے روک دیں اور اُس کے راستے میں دیوار بن جائیں۔

ہ۔ موقف اور رائے میں اختلاف کے جن آداب کا خیال رکھنا چاہیے ان کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر سمیع الحق[43] کہتے ہیں کہ اختلاف تو انسان کی فطری چیز ہے۔ لوگوں کی طبائع مختلف ہیں، اُن کی مصلحتیں مختلف ہیں اور وہ ایک جیسے بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اختلاف نہ ہوں لیکن جب مقالہ نگار کسی سے اختلاف کرے تو اُسے چاہیے کہ وہ اختلاف کے آداب کا خاص خیال رکھے۔ اگر وہ اختلاف کے آداب کا خیال رکھے گا تو دوسرے لوگ اس کو محترم سمجھیں گے۔ دوسروں کے ہاں اس کی بات کی اہمیت ہو گی۔ وہ بھی اس کے خلاف لکھتے ہوئے آداب کا خیال رکھیں گے۔[44]

و۔ کسی موضوع کے اندازِ تحریر کی بات سمجھاتے ہوئے ڈاکٹر سمیع الحق کہتے ہیں کہ مقالہ نگار ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کوئی ایسی تحقیق پیش نہ کرے جسے لوگ اپنا ہتھیار بنائیں اور اسلام کے خلاف، قرآن کے خلاف، نبی رحمت حضرت محمد ﷺ کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف اسے استعمال کریں۔ تو ایسی ریسرچ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس ریسرچ کی وجہ سے ریسرچر خود بدنام ہو جائے گا اور فائدے کی بجائے نقصان ہی ہو گا۔[45]

ز۔ مقالے میں ترتیبِ دلائل پر زور دیتے ہوئے ڈاکٹر سمیع الحق کہتے ہیں کہ مقالہ نگار جو بات بھی کرے وہ استدلال پر مبنی ہو، دلائل پر مبنی ہو۔ اس استدلال میں اس کو چاہیے کہ سب سے پہلے اپنوں کی بات لائے یعنی قرآن مجید، نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، مفسرین، محدثین وغیرہ۔ تو ان لوگوں کو سب سے پہلے لائے۔ جو بات ہو رہی ہے ان کی مدد سے اس کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے۔[46]

ح۔ ایچ ای سی کے مجلات میں اشاعت کے لیے پیش کیے جانے والے مقالات کی ایک عجیب قسم وہ مقالات ہوتے ہیں جنہیں مقالہ نگار نے اپنے ایم اے، ایم فل یا پی ایچ ڈی کے تھیسس سے نکالا ہوتا ہے۔ اِن میں غلطیاں اور کمزوریاں بھی مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں جب میں نے ڈاکٹر محمد سجاد سے سوال کیا کہ بہت سے لوگ اپنے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تھیسس سے کوئی فصل یا مبحث یا کچھ حصہ نکال کر بطور مقالہ جمع کروا دیتے ہیں۔ اس حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟ تو

انہوں نے جواب دیا کہ آپ کی بات بالکل صحیح ہے کہ اکثر مقالہ نگار اپنی تحقیقات جو ایم اے، ایم فل یا پی ایچ ڈی سطح کی کرتے ہیں اسی میں سے مقالات نکالتے ہیں۔ تھیسس کا کوئی باب، کوئی فصل، یا کوئی مبحث نکال کر اسے مقالے کا عنوان دے دیتے ہیں ۔اس قسم کے مقالے میں سب سے بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ اس کے اندر کوئی اِرتقاء نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ وہ درمیان میں سے نکالا جاتا ہے اور اس سے پہلے کیا کچھ لکھا گیا ہے اور اس کے بعد کیا کچھ لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے مندرجات میں ربط نہیں ہوتا ۔ ایسے مقالات بغیر سوچے سمجھے ہمارے پاس بھی بھیج دیے جاتے ہیں لیکن انہیں پڑھنے والوں کے لئے بہت دشواری پیش آتی ہے۔ اس مقالے کی کوئی ابتداء بھی تو ہونی چاہیے، کوئی انتہاء بھی ہونی چاہیے، کوئی نتائج ہونے چاہئیں ۔ بعض دفعہ تو یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ اب وہ کہاں گزر چکی ہے؟ وہ اس سے پہلے کسی باب یا کسی فصل میں لکھ چکا ہوتا ہے ۔ وہ مقالے میں ان جملوں کو تبدیل کرنا یا حذف کرنا گوارا نہیں کرتے۔ یہ بڑا مسئلہ اور بڑی کمزوری ہوتی ہے ۔ ایسا مقالہ ادھورا ہوتا ہے،اس میں ریسرچ نہیں ہوتی۔ہاں ریسرچ کے کسی پہلو کی طرف اشارہ تو مل جاتا ہے لیکن ٹھوس علمی معلومات نہیں ملتیں۔ اس لئے مقالہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس مبحث یا باب پر بات کر رہا ہے اسے پہلے ایک مستقل عنوان دے۔ پھر اس عنوان کے تقاضوں کے مطابق اس مقالے کو ڈھالے۔ اسے یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ سطح پی ایچ ڈی کی تھی۔ اس کے تقاضے کچھ اور تھے ۔ اب یہ مقالہ کسی مجلے میں پیش کرنا ہے تو اس مجلے کی جو بنیادی ضروریات اور تقاضے ہیں انہیں اچھی طرح پورا کرے۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہوتا ہے جبکہ یہ بڑی کمی ہے ہمارے ہاں۔[47]

ڈاکٹر محمد سجاد کی اس بات میں اُن مقالہ نگاروں کے لیے بہت قیمتی معلومات، عبرت اور سنجیدہ رہنمائی پائی جاتی ہے جو اپنے ایم فل یا پی ایچ ڈی کے تھیسس سے کوئی فصل یا مبحث نکال کر اُسے بطور تحقیقی مقالہ بنانا اور شائع کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ بہت سے مجلات میں اس قسم کے مقالات برائے اشاعت قبول ہی نہیں کیے جاتے کیونکہ اِن کی اشاعت ایک لحاظ سے پہلے ہو چکی ہوتی ہے۔ مثلاً یہ تحقیق پہلے نگرانِ مقالہ، داخلی اور خارجی ممتحن پر مشتمل ایک کمیٹی کے سامنے پیش ہو چکی ہوتی ہے، زبانی امتحان (Viva voce یا مناقشہ) کے دوران میں شرکاء اور سامعین امتحان تک یہ تحقیق پہنچ چکی ہوتی ہے، اور اس تھیسس کے تصحیح شدہ آخری مجلد نسخے یونیورسٹی اور اس کی لائبریری میں جمع ہو چکے ہوتے ہیں۔ اَب اس کتاب سے اتنی طویل عبارات اور بحث اُٹھا کر بطور مقالہ شائع کرنا علمی سرقہ کے زُمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ اِس سے اجتناب کرنا ہی سنجیدہ محقق کی شان اور عظمت کی علامت ہے۔

6. خاتمۂ بحث اور اُس کے عناصرِ ترکیبی

ایک معیاری مقالے کی بنیادی خصوصیات میں اس کے موضوع کا جدید اور اچھوتا ہونا، اس کے عنوان کی عبارت کا جھول اور ابہام سے پاک ہونا، اس کا حُسنِ آغاز، دلچسپ مگر نپا تُلا اُسلوبِ بیان، عالمانہ زبان، انتہائی دُرست الفاظ کا چناؤ، الفاظ اور جملوں کے تکرار سے اجتناب، لفظی اور معنوی اقتباسات کی دُرست تنسیق، سرقہ سے پرہیز، مواد کی معقول ترتیب و تنظیم، پیرا گرافوں میں توازن، پورے مقالے کی عبارت میں پیش کیے گئے تمام افکار اور اُن کی سب کڑیوں کا باہمی ربط، چھوٹے مگر گرامر کے لحاظ سے درست جملے، مقالے میں مذکور تمام تاریخوں کا ہجری اور ان کے مطابق عیسوی سِنین کا اہتمام، حوالوں میں تمام معلومات اپنی اُصولی ترتیب کے ساتھ ہونا، حواشی اور تعلیقات کا اپنے مقام پر درست بیان، نتائج کا منطقی اور جدید ہونا، وغیرہ شامل ہیں۔

یہ سب اجزاء اپنی دُرست جگہ اور صحیح مقام پر آ جائیں تو خاتمۂ بحث کی چیزوں کو تین عناصر میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ وہ تینوں عناصر یہ ہیں۔ (۱) تحقیق کے منطقی اور نمبر وار نتائج، (۲) نتائج تحقیق کے نفاذ اور اطلاق کی سفارشات، اور (۳) موضوع سے متعلق مزید تحقیق کی تجاویز۔ انہیں لکھتے ہوئے بہت دھیان دینا چاہیے کیونکہ یہی ساری بحث کا حاصل ہوتے ہیں۔ اِن تینوں کو لکھتے وقت جن تقاضوں کو پورا کرنا ہوتا ہے اُن کی کچھ تفصیل ملاحظہ کیجیے:

(۱) نتائج بحث

کسی موضوع پر تحقیق کے نتائج کی واضح نشاندہی اور صاف ستھرا بیان ہی تحقیق کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ ان نتائج کی کیفیت، نوعیت یا طبیعت ایسی ہوتی ہے کہ وہ پیش کردہ تحقیق کے بغیر کسی بھی طریقے سے نہ تو معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ اکثر مقالات میں یہ ایک بہت بڑی کمی اور خامی پائی جاتی ہے۔ اُن مقالات کے کوئی سنجیدہ، دلچسپ اور منطقی نتائج نہیں ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار اپنے مقالہ کے مقدمہ میں موضوع کے تحقیق طلب سوال ہی نہیں اُٹھاتے۔ ایسی صورت حال میں یہ کبھی نہیں بتایا جا سکتا کہ مقالہ کے نتائج تحقیقی، منطقی اور معقول ہیں۔ مقدمہ میں اگر انسانی زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق قابل توجہ اور حل طلب مسئلہ کا ذکر ہی نہیں کیا گیا تو بحث کے نتائج کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہوتی اور نہ ہی نتائج کو دُرست یا غلط قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۲) نتائج تحقیق کے نفاذ اور اطلاق کی سفارشات

بحث کے اختتام پر مقالہ نگار کے لیے یہ لازمی ہوتا ہے کہ اُس نے مسئلہ کے حل کے لیے جو نتائج اپنی بحث سے اخذ کیے ہیں وہ انہیں نافذ کرنے کے ممکنہ اور عملی طریقے بھی بتائے۔ تاکہ اس کی تمام کاوش با معنی اور با مقصد ثابت ہو۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبد الحمید عباسی کہتے ہیں کہ محقق نے جو نتائج نکالے ہیں وہ یہ بھی بیان کرے کہ ان کی تنفیذ کیسے ہونی چاہیے؟ اگر آپ اصلاحی اور محنتی قسم کے محقق ہیں تحقیق کریں گے تو نتائج کی تنفیذ کر لیں گے۔ لیکن اگر کیا جانے والا تحقیقی کام عام پبلک کے لیے ہے تو تنفیذ کیسے ہو گی؟ یہ تو وہی بتا سکتا ہے جس نے تحقیق کی ہے کہ اس کو اس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے، معاشرے کے اندر اس کو اِس طرح پھیلایا جا سکتا ہے، اس کی تشہیریوں کی جا سکتی ہے تاکہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ تو وہ تحقیق تحقیق ہی نہیں ہوتی جو آنے والوں کے فائدے کا باعث نہ بنے۔[48]

(۳) موضوع سے متعلق مزید تحقیق کی تجاویز

شاید ہر ایک موضوع پر تحقیق کے لیے یہ ناگزیر نہ ہو لیکن اکثر موضوعات ایسے ہوتے ہیں جن کے خاتمہ میں مقالہ نگار کو اس موضوع کے مزید تحقیق طلب پہلوؤں کی نشاندہی کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ جب ایک مقالہ نگار اپنے تحقیقی کام کا ایک نظری خاکہ بنا رہا ہوتا ہے اور ابھی اسے عملی طور پر شروع نہیں کیا ہوتا اس وقت وہ نہ تو موضوع کے تمام پہلوؤں کو جانتا ہے اور نہ ہی اُن کے تحقیق طلب ہونے پر کوئی رائے دینے کی پوزیشن میں ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے متعین اور محدود کام کے اختتام کی طرف آ پہنچتا ہے تو چونکہ اپنے تحقیقی سفر کے دوران موضوع کے متعلقات سے براہِ راست آگاہی حاصل کر لیتا ہے تو اب وہ یہ بتانے کی پوزیشن ہوتا ہے کہ موضوع کا کونسا پہلو تحقیق طلب ہے۔ اگر مقالہ نگار حاضر دماغی، چُستی و چالاکی اور اخلاص سے کام کرے تو اُس کے لیے یہ بتانا مشکل نہیں ہوتا کہ مزید کونسے گوشوں پر تحقیق ہو سکتی ہے۔ اس لیے مقالہ نگار کو اس نکتے پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر عبد الحمید عباسی کہتے ہیں کہ اصحابِ مقالہ کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کون کون سی سفارشات کر رہے ہیں؟ کون کون سی تجاویز دے رہے ہیں؟ کون کونسی توصیات پیش کر رہے ہیں؟ آپ کو بتانا چاہیے کہ یہ میرا موضوع تھا۔ اس پر میں نے جو کام کیا ہے وہ حتمی نہیں ہے۔ آنے والے محققین کے لیے اس میں گنجائش موجود ہے۔ نمبر ایک اس پہلو سے، نمبر دو اس پہلو سے، ترجمہ کے اعتبار سے، تحقیق کے اعتبار سے، موضوعات کے اعتبار سے، اور اس سے تعلق رکھنے والی کتابوں پر تحقیق کے اعتبار سے۔ تو بہت سارے پہلو ہوتے ہیں۔ یہ وہی محقق بتا سکتا ہے جس نے سچے انداز سے تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہو اور سچے انداز سے تحقیق پیش کی ہو۔[49]

ڈاکٹر صاحب کے اس بیان میں اس عنصر کو لکھنے کے لیے جو رہنمائی کی گئی ہے اس کی پیروی کریں گے تو مقالہ کی وقعت بڑھے گی اور وہ آسانی سے اشاعت کی منظوری حاصل کر لے گا۔

7. مصادر و مراجع

کسی تحقیقی مقالے کی قدر و قیمت اس امر سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ مقالہ نگار نے کتنے اساسی، بنیادی اور معتبر مصادر سے استفادہ کیا ہے اور کتنے اہم مراجع و منابع کو چھوُا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک مقالہ نگار کے لیے یہ بھی لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مصادر و مراجع کی مکمل معلومات بیان کرے تاکہ اگر کوئی اس کے اقتباسات اور نقل کردہ افکار کی تصدیق وتوثیق کرنا چاہے یا اس کی مدد سے اپنی تحقیق کو آگے بڑھانا چاہے تو اس کے لیے کوئی مشکل نہ ہو۔ بعض اوقات مقالہ نگار حوالہ جات میں نہ مصنف کا پورا نام لکھتے ہیں، نہ ناشر کا، نہ مقام طبع کا، نہ طبع نمبر کا۔ ایسا کرنے سے اُن کے کام کی اہمیت پست ہو جاتی ہے اور وہ جائزہ رپورٹ لکھنے والے ماہرِ مضمون کی نظروں سے گر جاتا ہے۔

اس کے علاوہ مقالہ نگار کو مصادر و مراجع کے بارے میں جن باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے اُن میں یہ شامل ہیں: (۱) موضوع کی نوعیت کے مطابق مصادر و مراجع کا استعمال، (۲) مصادر و مراجع کے مرتبے اور درجے، (۳) کتب لغت، معاجم اور قوامیس کا استعمال، اور (۴) حوالہ جات کے اُصول و ضوابط اور تخریج۔ اِن کی مختصر توضیح درج ذیل ہے۔

(۱) موضوع کی نوعیت اور مصادر و مراجع

موضوع کا تعلق اگر قرآن، حدیث، سیرت، فقہ، قانون، تصوف، علم الکلام، فلسفہ، ادیان یا اِن کی کسی ذیلی شاخ سے ہو تو ایسے اَساسی مصادر و مراجع سے زیادہ استفادہ کیا جائے جو اُسی علم یا اُس کی شاخ سے متعلق ہوں۔ مقالہ نگار کو چاہیئے کہ اگر اس کا موضوع کسی فرقہ یعنی معتزلہ، اشاعرہ، اِئمہ اثنا عشریہ، امامیہ وغیرہ کے متعلق ہو تو وہ اُنہیں کی بنیادی کتب اور منابع سے ہی زیادہ استفادہ کرے نہ کہ تصوف و اخلاق یا اسلامی فرقوں کی تاریخ جیسی کتب سے۔ اسی طرح انگریزی مصادر و مراجع سے اُس وقت اقتباس لے جب عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں مسلمانوں کی اپنی کوئی کاوش نہ پائی جائے۔

اگر موضوع تقابلی نوعیت کا ہو تو مقالہ نگار دونوں جہتوں کے اساسی مصادر کے استعمال میں متوازن رویے کا مظاہرہ کرے۔ تقابلی تحقیقی کام میں برابر کی سطح کے مصادر و مراجع کے استعمال میں متوازن رُجحان کا فقدان عام ہے۔

(۲) مصادر و مراجع کے مرتبے اور درجے

مصادر و مراجع کے مختلف مرتبے اور درجے ہوتے ہیں۔ اُن میں کوئی اساسی اور بنیادی ہوتے ہیں تو کوئی ثانوی اور کم اہمیت کے۔ ان سب کا طریقہ استعمال اور اندازِ اخذ و استدلال الگ الگ ہے۔ اس سلسلے میں مقالات میں انواع و اقسام کی خامیاں اور

خرابیاں پائی جاتی ہیں۔اپنے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے اس بارے میں ڈاکٹر محمد سجاد کہتے ہیں کہ مقالوں میں ایک بہت کمزور عنصر یہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار ثانوی مصادر پر اعتبار کرتا ہے۔عام طور پر مقالہ نگار ثانوی مصادر پر بھی بحوالہ کرکے بالواسطہ انحصار کرتے ہیں۔براہ راست ہو پھر بھی ٹھیک ہے ۔ وہ اگر اصل مصدر پر جائیں تو وہاں اُنہیں متن ہی کچھ اور ملے گا۔ مقالہ نگار ثانوی مصادر سے نقل کرکے حوالہ اصل کا دے رہے ہوتے ہیں جبکہ اصل میں وہ چیز ہوتی نہیں ہے۔تو یہ بہت بڑی کمزوری اور خرابی ہے۔ ہم نے ایم فل کے طلبہ کی ایک مشق کرائی۔انہیں کہا کہ آپ ایسا کریں کہ اپنی پسند کے ایچ ای سی سے منظور شدہ ریسرچ جرنل لیں۔اُن میں سے ایک عربی کا، ایک انگریزی کا، اور ایک اردو کا کوئی بھی آرٹیکل لیں ۔ان پر تبصرہ اور اُن کا تجزیہ کریں۔ تجزیے کا طریقہ یہ ہو کہ سب سے پہلے دیکھیں کہ آپ کے خیال میں اس کا کیا عنوان بنتا ہے؟ مقالہ نگار نے عنوان کیا بنایا ہے؟ واقعی اس عنوان میں ریسرچ کا کوئی پہلو ہے کہ نہیں؟ دوسرا یہ دیکھیں کہ اُس کے مواد کے مصادر کیا ہیں؟ اس کے مصادر کیسے ہیں؟ تیسرا ہم نے ان سے یہ کہا کہ جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھیں کہ انھوں نے جو مواد لیا ہے، جو اقتباس لیے ہیں، ان میں اقتباسات کی کونسی قسمیں ہیں؟ بالواسطہ ہے یا براہ راست ہے؟ تلخیص ہے، اخذ ہے یا کوئی اور قسم کا لیا گیا ہے۔ پھر اگر براہ راست ہے تو اصل متن کے ساتھ آپ چیک کریں کہ وہ متن جہاں سے انھوں نے لیا ہے وہ متن ایسا ہی ہے یا نہیں؟ معلوم یہ ہوا کہ قرآن کی آیات، حدیث کا متن، فقہ کی عبارتیں سب میں بھیانک غلطیاں تھیں۔[50]

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان مبتدی اور نوآموز مقالہ نگاروں کے لیے بہت بڑی تنبیہ ہے۔ جو مقالہ نگار چاہتے ہیں کہ اُن کے مقالات رد نہ ہوں ان کے لیے مذکورہ عملی تجربے میں کافی سامان عبرت و نصیحت ہے۔

(۳) کتب لغت، معاجم اور قوامیس کا استعمال

مصادر و مراجع کے غلط استعمال میں سے ایک بہت گھمبیر مسئلہ غیر متعلق کتب لغت، معاجم اور قوامیس کا استعمال ہے۔ اس سلسلے میں اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد سجاد کہتے ہیں کہ ہمارے اکثر مقالے لغۃً واصطلاحاً سے آغاز کرتے ہیں کہ موضوع کی کلیدی اصطلاحات کا لغوی معنی کیا ہے؟ اصطلاحی معنی کیا ہے؟ اس سلسلے میں جو غلطی عموماً پائی جاتی ہے وہ ہے بہت ثانوی اور سطحی درجے کی کتبِ لغت پر انحصار اور اُن سے آغاز۔ مثلاً المنجد لے لیں۔ حالانکہ علم و فن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اگر موضوع تفسیر کا ہے تو لغات القرآن کی طرف جانا چاہیے، مفردات القرآن کی طرف جانا چاہیے۔ اسی طرح اگر خالصۃً عربی زبان کا مسئلہ ہے تو پھر وہ لغات اور قوامیس دیکھی جائیں گی جو زبان وادب کے حوالے سے بہت معتبر ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ مقالہ کا موضوع فقہ ہے تو لُغت کی کسی عام کتاب کا حوالہ دیا جارہا ہوتا ہے حالانکہ قانونی لغت کی الگ کتابیں موجود ہیں۔ یعنی عام مقالہ نگاروں کو منہج کا پتا ہی نہیں ہوتا۔ اگر اِصطلاحی معنی بیان کررہا ہے تو اس فن کے ماہرین کی آراء لانی چاہئیں جبکہ عام صورت حال یہ ہے کہ کسی اور فن کے ماہر کی رائے پیش کی جارہی ہوتی ہے۔ بھئی اس فن کی تعریف اور ہے اگر آپ فقہ کے لحاظ سے معنی متعین کررہے ہیں تو پھر فقہاء کی آراء آئیں گی۔ اگر آپ تفسیر کے لحاظ سے کوئی معنی متعین کررہے ہیں مثلاً ایمان کا معنی۔ تو ایمان کے لفظی اور اصطلاحی معنی کے لیے مفسرین یا عقیدے کے علماء کی آراء لی جائیں گی۔ اکثر مقالہ نگاروں کو اس کا پتا نہیں ہوتا ، انہیں لغت کے استعمال کا پتا نہیں ہوتا، استشہاد کا نہیں پتا، استنباط کا نہیں پتا۔ یہ کمزوری ایچ ای سی کے منظور شدہ مجلات کے لیے بھیجے جانے والے اکثر مقالات میں پائی جاتی ہے۔[51]

(۴) حوالہ جات کے اُصول و ضوابط اور تخریج

مصادر و مراجع اور اقتباسات کے متعلق ایک عنصر تخریج ہے۔ پیش کردہ اکثر مقالات میں اس عنصر کے متعلق کئی قسم کی خامیاں پائی جاتی ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد سجاد نے انٹرویو کے دوران میں بتایا کہ مصادر کا حوالہ تو دے دیا جاتا ہے مگر حوالہ جات میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ یہ ہمارے مقالات اور مجلات کی بہت بڑی کمزوری ہے۔حوالہ جات کے اندراج کے لیے ایک ہی مجلے بلکہ ایک ہی مقالے میں دس طرح کے انداز پائے جاتے ہیں۔ مصادر و مراجع کی فہرست بنانے میں بھی کئی طریقے ہیں۔ایک ہی مجلے میں پانچ چھے طریقے استعمال ہو رہے ہیں۔اگر اس سے آگے انگریزی میں جائیں گے اور ہیں، عربی میں جائیں کچھ اور ہیں، اردو میں جائیں کچھ اور ہیں۔مدیر کی ذمہ داری ہے کہ ایک طے شدہ منہج کا اطلاق کرے۔ مقالہ نگار کو بھی لکھ کے دے دیا جائے کہ مجلے کا یہ فارمیٹ ہے اس کے مطابق آپ مقالے ترتیب دیں لیکن ایسا نہیں کیا جاتا، اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔[52]

8. مقالات کی اشاعت میں تاخیر کے اسباب

اکثر مقالہ نگار یہ گلہ شکوہ کرتے ہیں کہ اُن کے مقالات اول تو اشاعت کے لیے قبول نہیں ہوتے۔اگر قبول ہو جائیں تو کئی ماہ یا کئی سال لگ جاتے ہیں۔اس سلسلے میں جب میں نے پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی سے سوال کیا کہ ہمارے ہاں جو محققین تجربہ کار ہیں اُن کے ریسرچ پیپر چھپنے میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا لیکن جو مبتدی اور نوآموز تحقیق کار ہوتے ہیں اُن کے مقالات کی اشاعت میں تاخیر بڑی حوصلہ شکن ہے۔ انہیں آپ کیا خاص ہدایات دیں گے جس سے اُن کا حوصلہ بڑھے اور اُن کے پیپر چھپ جایا کریں؟

اس سوال کے جواب میں اُنہوں نے کہا کہ ریسرچ پیپر چھاپنے کا مسئلہ صرف نوآموز لوگوں کا نہیں ہے۔ جو سینئر اساتذہ ہیں ان کے ریسرچ پیپر کی اشاعت کے بھی بڑے مسائل ہیں۔ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایچ ای سی سے جو منظور شدہ جرنلز ہیں اُن کی تعداد بہت کم ہے جبکہ اس فیلڈ میں ہمارا جو اکیڈیمیا ہے وہ بڑا وسیع ہے۔ بلکہ اب تو اس میں اور وُسعت آ گئی ہے۔ پی ایچ ڈی کی جو ریسرچ ہے اس کے لئے بھی ایچ ای سی نے یہ شرط لگا دی ہے کہ جب تک پی ایچ ڈی سکالر کا آرٹیکل شائع نہیں ہو گا اُسے ڈگری نہیں ملے گی۔ تو جس طرح آپ اکنامکس میں یا کہیں بھی دیکھتے ہیں کہ ڈیمانڈ اور سپلائی یعنی طلب اور رسد میں ایک توازن ہونا چاہیے۔ یہاں ڈیمانڈ بہت زیادہ ہے اور سپلائی بہت محدود ہے۔ تو مقالات کی اشاعت کے لئے پاکستانی رائٹرز کے لئے خاص طور پر جو اردو میں لکھنے والے ہیں اُن کے لئے بڑے مسائل ہیں۔ انگریزی والے تو باہر بھی چھپوا سکتے ہیں۔ تو اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ یونیورسٹیز اور تحقیقی ادارے زیادہ سے زیادہ اپنے ریسرچ جرنل شائع کریں اور اس کے لئے ایچ ای سی کے incentives بھی ہیں۔ان سے بھی فائدہ اُٹھائیں تو یہ اصل مسئلے کا حل ہے۔[53]

9. ایچ ای سی کے مجلات کی درجہ بندی اور اُن کے معیار کا فرق

زیر نظر مقالہ کے شروع میں ہم نے یہ ذکر کیا تھا کہ HEC کے منظور شدہ مجلات WXYZ کیٹگریوں میں تقسیم ہیں۔اُن مجلات کی اِن کیٹگریوں میں تقسیم اور اُن میں شائع ہونے والے مقالات کے معیار کے درمیان فرق کا سوال جب میں نے انٹرویو کے دوران ڈاکٹر محمد سجاد سے کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ HEC جو معیارات بناتی ہے زیڈ درجہ اُن کے نزدیک سب سے کمزور یعنی ابتدائی درجہ ہے۔اس کے بعد بتدریج وائی، ایکس اور ڈبلیو کیٹگری ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی کئی بنیادی شرائط ہیں۔مجلے کے اندر مجلس ادارت اور مجلس مشاورت میں قومی اور بین الاقوامی ممبران کی تعداد پچاس پچاس فی صد ہونی چاہیے۔اس میں ترقی یافتہ

ممالک کے جو اساتذہ اور سکالر ہیں ان کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ یہ پہلی شرط ہے۔ پھر ISSN نمبر ہونا چاہیے، آرٹیکل کا ریویو (Peer Review) ہو، اس کے علاوہ آرٹیکل کا خلاصہ (Abstract) بھی لکھا جائے۔ اس کے علاوہ جو بنیادی شرائط ہیں وہ پوری ہوں تو مجلّہ زیڈ کیٹگری میں جاتا ہے۔ Y درجے میں باقی شرائط کے علاوہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کے کم از کم پچاس فی صد مقالات کی Evaluation باہر سے ہو۔ یہ سارے مقامی نہ ہوں بلکہ آپ بیرونِ ملک سے بھی پچاس فی صد کروایں۔ اور X درجہ کا جو مجلّہ ہے اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ وہ سو فیصد باہر سے اس کی Evaluation کرائیں وہاں سے جائزہ رپورٹ لیں۔ اور اس میں انڈیکسنگ ہو۔ اور W درجہ کے لیے یہ ہے کہ اس کی سائی ٹیشن (Citation) ہوتی ہو یعنی کہ اُس مجلّہ سے مختلف لوگ استفادہ کریں۔ اس سے اقتباس کتنا لیا جاتا ہے؟ اس سے کتنا حوالہ دیا جاتا ہے؟ کن کن جگہ سے اس کے ریفرنسز ملتے ہیں۔ وہ مقالہ کتنے لوگوں نے استعمال کیا ہے؟ Web پر اس کا اندراج اور موجودگی اگر زیادہ ہوگی تو یونیورسٹی کی رٹینگ بھی بڑھے گی، مجلے کی رٹینگ بھی بڑھے گی اور اسی بنیاد پر اس کا درجہ بھی متعین ہوتا ہے۔[54]

اسی جواب کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے یہ سوال کیا کہ یہ تو مجلے کی مجلس ادارت کے کام ہیں۔ آپ مقالہ نگاروں کو اس حوالے سے کن چیزوں کو پیش نظر رکھنے کی تجویز اور مشورہ دیں گے؟ تو انہوں نے کہا کہ اصل میں مقالہ نگار کے لیے تو یہ ضروری ہے کہ اس کا مقالہ اس پایہ کا ہو کہ چھپ سکے۔ اس کا معیار سخت ہوگا یعنی اس کی (Citation) ہونی ہے، اس نے پوری دنیا میں جانا ہے، اس کی Evaluation ہوگی، انگریزی میں مُلخص بھی پیش ہوگا، اس میں سرقہ (plagiarism) نہ ہو۔ مقالہ میں دوسروں کے مصادر کا استعمال تو ہو سکتا ہے لیکن اس میں دوسروں کی آراء کم سے کم ہوں تجزیہ، جانچ پرکھ، تعمیری نقد زیادہ ہو۔ معیاری مجلے کے لیے پھر ظاہر ہے کڑا معیار ہے۔ وہ اِن چیزیں کی اور تراجم کے اہتمام، ایڈیٹنگ، وغیرہ سب چیزوں کی شرائط لگاتے ہیں۔[55]

10. خاتمہ وخلاصہ بحث

زیر نظر مقالہ کے مقدمہ میں یہ سوالات اُٹھائے گئے تھے کہ ایچ ای سی کے منظور شدہ تحقیقی مجلات کے لیے لکھے جانے والے مقالات کا ریفری یا ریویو کرنے والا ماہرِ مضمون کِن اُمور کو بنیاد بنا کر اور کِن قواعد وضوابط کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقالے کا جائزہ لیتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں اِسی سوال کو یوں پوچھا جا سکتا ہے کہ قابلِ اِشاعت قرار دیئے جانے والے مقالہ کے عناصرِ ترکیبی کیا ہوتے ہیں؟ اور ہر عنصر کو لکھتے وقت کن تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے؟ اِن سوالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس بحث کو جو جوابات ملے ہیں اُن کی تفصیل مع دلائل اُوپر اِس مقالہ کے مرکزی حصے میں گزر چکی ہے۔ یہاں چند اہم نتائج کا نمبر وار خلاصہ پیش ہے۔

1. مقالے کا موضوع نیا، اچھوتا، تحقیق طلب اور مفید ہو۔ منتخب موضوع پر تحقیق سے ملک وملت کا کوئی نہ کوئی مسئلہ حل ہوتا ہو۔ مکھی پر مکھی مارنے والی نوعیت کا نہ ہو۔
2. عنوان کی عبارت دو حصوں میں منقسم، آسان، غیر مبہم، جاذب نظر اور موضوع کی حدود پر دلالت کرنے والی ہو۔
3. مقالے کا Abstract بحث کے بنیادی سوال اور اس کے جوابات کے تمام مرکزی نکات کا جامع خلاصہ ہو۔
4. مقالہ کی مناسب تمہید لکھی جائے اور اس کے مقدمہ میں آٹھ عناصر یعنی موضوع کا تعارف، اہمیت

وضرورت، اسبابِ اختیار، بنیادی سوال، سابقہ کام کا جامع جائزہ، حدودِ بحث، اغراض ومقاصدِ تحقیق، اور منہج تحقیق کی وضاحت شامل ہوں۔

5. مقدمہ کے بعد مگر مرکزی بحث سے پہلے مقالے کی مرکزی نکات کا خاکہ پیش کیا جائے۔

6. مقالے کے مرکزی حصہ میں موضوع کے تمام افکار میں گہرے ربط اور اُن کی ترکیبی کڑیوں میں تاریخی یا عقلی یا کسی منطقی ترتیب کا خاص لحاظ رکھا جائے۔

7. مرکزی بحث میں پیش کی جانے والی احادیث پر محدثین کا حکم کا ذکر کیا جائے۔ بقیہ مصادر سے منقول لفظی یا تلخیصی اقتباس سے پہلے اُن کے لیے تعارفی جملے اور بعد میں وجہِ استدلال، تجزیہ اور اُن میں مذکور افکار کی قدر وقیمت کا تعین اور تعمیری نقد ضرور پیش کی جائے۔

8. مرکزی بحث میں استعمال کیے جانے والے تمام مصادر ومراجع اساسی، موضوع کی نوعیت اور میدان تخصص سے ہم آہنگ ہوں۔ اُن سے استفادہ اور اخذ اقتباسات میں تاریخی ترتیب اور درجۂ اِستناد کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

9. مقالے کے پورے متن میں اِملاء، رسم الخط، رموزِ اوقاف اور رسمیاتِ مقالہ کے دُرست استعمال کے ساتھ ساتھ صحتِ کتابت کا خاص اہتمام کیا جائے۔

10. کسی بھی اقتباس کے حوالہ کے لیے تمام مطلوبہ عناصر اپنی دُرست ترتیب، اور مقالے میں وارد تمام شخصیات کے مختصر تعارف مع سَن ولادت ووفات کا مکمل دھیان رکھا جائے۔

11. مقالے کی زبان اور اُسلوب حکیمانہ، دلچسپ اور اہدافِ بحث کو حاصل کرنے میں مددگار ہو۔

12. مقالے میں از ابتداء تا انتہاء تحقیقی کام کی اخلاقیات کا دامن کسی صورت ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ علمی سرقہ اور جامعات میں پیش کردہ ایم فل یا پی ایچ ڈی کے تھیسز سے کوئی فصل یا مبحث کو بطورِ مقالہ پیش کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

13. مقالہ کے خاتمہ کے تینوں عناصرِ ترکیبی یعنی نتائج بحث، سفارشاتِ تنفیذ اور تجاویزِ تحقیقِ مزید پر پوری ذہنی صلاحیت صرف کی جائے اور یہ موضوع، مرکزی بحث اور اُس کے بنیادی سوال، سوالات سے مکمل ہم آہنگ ہوں۔

14. مقالہ کے آخر میں "حواشی اور حوالہ جات" یا "مصادر ومراجع" کی ایک ایک چیز مروّجہ اُصول تحقیق کے بالکل مطابق ہو۔

نتائج بحث کے نفاذ اور اطلاق کی سفارشات

یہ مقالہ اپنے موضوع " علوم اسلامیہ میں قابلِ اِشاعت تحقیقی مقالہ کے عناصرِ ترکیبی اور تقاضے: ہائر ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان کے منظور شدہ مجلّات کے تناظر میں ایک تنقیدی اور تعمیری مطالعہ " پر بحث کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے اُن کی تنفیذ کے لیے درج ذیل اقدامات کی سفارش کرتا ہے:

1. بحث کے نتائج کے عملی طور پر نفاذ کا پہلا قدم اس مقالہ کی اِشاعت اور مقالہ کے مخاطبین یعنی ناپختہ مقالہ نگاروں تک اس کا پہنچنا ہے۔

2. اگلا قدم یہ ہے کہ مقالہ کے مخاطبین اگر ابھی ایم فل یا پی ایچ ڈی کی ڈگری کے کورس ورک کے مرحلے میں طالب علم ہوں تو اِس مقالہ کو اُس مواد اور نصاب میں شامل کیا جائے جو انہیں کورس ورک کے طور پر پڑھایا جا رہا ہے۔ مقالہ چونکہ طویل ہے اس لیے یہ دو گھنٹوں کی صِرف ایک کلاس میں مکمل نہیں پڑھایا جا سکتا۔ لہٰذا حسبِ ضرورت چھ یا آٹھ گھنٹوں کے دورانیے پر مشتمل تین یا چار کلاسوں میں کوئی تجربہ کار اُستاد اس مقالہ کے ایک ایک عنصر پر تفصیلی روشنی ڈالے اور اُن کی توضیح و تشریح اس انداز میں کرے کہ نوآموز شخص ایک تحقیقی مقالہ کے تمام عناصر ترکیبی کو مکمل جان لے اور اُسے لکھنے کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ لے۔

3. اس کے بعد تیسرا قدم یہ ہے کہ نوآموز اور ناپختہ مقالہ نگار اپنی پسند اور رُجحان کے کسی منتخب موضوع پر مقالہ تیار کرے اور اُسے برائے اشاعت ارسال کرنے سے پہلے زیر نظر مقالہ کی روشنی میں ہر ایک عنصر اور اُس کے تقاضوں کا خود اچھی طرح جائزہ لے۔ پوری احتیاط سے یہ دیکھے کہ تمام مطلوبہ عناصر اپنے اپنے مقام پر اور اپنی مناسب شکل وصورت میں موجود ہیں یا نہیں۔ یعنی مقالہ نگار اپنے مقالہ کا بحیثیتِ ریفری خود جائزہ لے اور اپنے کام کو خود احتسابی کی آزمائش سے گزارے۔ اس دوران میں اگر کوئی کمی، کوتاہی یا خامی نظر آئے تو اُسے دور کرے۔ مناسب ہو گا کہ وہ اپنے مقالے کا ایک جائزہ لینے کے بعد زیر نظر مقالہ کا دوبارہ مطالعہ کرے اور اپنے مقالے کو ایک بار پھر پڑھے۔ شاید کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہو تو اُس کی اصلاح اور تکمیل کرے۔

4. اپنے مقالہ کا خود تنقیدی جائزہ لینے اور اپنے طور پر مکمل اطمینان کرنے کے بعد اگلا مرحلہ یہ ہے کہ مقالہ کو کسی پختہ تجربہ کار اُستاد یا سنجیدہ محقق کی نظروں سے گزارا جائے۔ اس مرحلہ پر سامنے آنے والی خامیوں پر بھی قابو پایا جائے اور اُن کی اصلاح کی جائے۔ جب یہاں بھی تسلّی ہو جائے تو پھر برائے اشاعت مقالہ بھیج دیا جائے۔ ان شاء اللہ الکریم ایسا مقالہ بغیر کسی مشکل کے شائع ہو جائے گا۔

موضوع کے مزید تحقیق طلب پہلو اور کام کی تجاویز

اِس مقالے کے سامنے زمان ومکان اور محدود اَہداف کی پابندیوں کی وجہ سے موضوع کے کئی گوشوں کو شاملِ تحقیق نہیں کیا جا سکا۔ مثلاً کسی تحقیقی مجلے میں اس مقالے کو شائع کرنے کے ہدف کو سامنے رکھا جائے تو اِس کی طوالت عام مقالات سے زیادہ ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس پر مزید کام کے لیے راقم الحروف کے پاس وقت کی کمی کا مسئلہ در پیش تھا۔ اس لئے مزید تحقیقی کام کے لیے تجاویز یہ ہیں:

1. اس مقالے میں جن چار اساتذہ کے انٹرویو شامل کیے جا سکے ہیں اُن کا تعلق تفسیر قرآن مجید اور قانون کے شعبوں سے ہے۔ تجویز یہ ہے کہ حدیث، فقہ اسلامی، سیرت النبی، اسلامی تاریخ، دعوت و تبلیغ، اسلامی فلسفہ، تقابل ادیان، عربی زبان وادب، وغیرہ میدانوں اور اُن کے ذیلی شعبوں میں تخصص رکھنے والے اساتذۂ فن کے انٹرویو لیے جائیں

اور معلوم کیا جائے کہ اِن میدانوں سے متعلق موضوع پر ایک قابل اشاعت تحقیقی مقالہ کے عناصر ترکیبی اور اُن کے تقاضے کیا ہوتے ہیں؟ اور اُنہیں کیسے پورا کیا جا سکتا ہے؟

2. دوسری تجویز یہ ہے کہ زیر نظر موضوع کے بارے میں علوم اسلامیہ میں تعلیم و تحقیق کے حوالے سے مشہور تمام پاکستانی جامعات کے ایسے تمام اساتذہ کے انٹرویو جمع کیے جائیں جو علوم اسلامیہ میں لکھے جانے والے مقالات کا ریویو کرتے ہیں تاکہ موضوع کے بارے میں مختلف افکار ایک جگہ جمع ہو جائیں اور نوآموز مقالہ نگاروں کو زیادہ سے زیادہ محققین کی فکر سے استفادے کا بہتر موقع میسر آسکے۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ ایچ ای سی کے مختلف علوم و فنون کے لیے منظور شدہ تحقیقی مجلات اور اُن کی کیٹیگریوں کی تفصیل اُن کی اس ویب سائٹ پر پائی جاتی ہے:
http://www.hec.gov.pk/InsideHEC/Divisions/QALI/QADivision/Pages/HECRecognizedJournals.aspx

2۔ تحسین اقبال، پروفیسر ڈاکٹر، علم تحقیق کا تعارف، (کراچی: ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ وفاقی اردو یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۷.

3۔ پروفیسر ڈاکٹر گیان چند جین ہندوستان کے ضلع بجنور، سیوہارا میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے تدریسی اور تحقیقی کردار کا آغاز حمیدیہ کالج بھوپال سے ہوا۔ وہ بحیثیت اُستاد، نقاد، محقق، ادیب اور شاعر کے مشہور ہوئے۔ اُن کی کتابوں میں تحقیق کا فن، ابتدائی کلام اقبال، اُردو کی نثری داستانیں اور عام لسانیات زیادہ مشہور ہیں۔ عام لسانیات کو ترقی اُردو بیورو نئی دہلی نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا تھا۔ اُن کی کتاب ''تحقیق کا فن'' کئی بار مقتدرہ قومی زبان پاکستان سے شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کیلی فورنیا امریکہ میں ۲۰۰۷ء میں فوت ہو گئے تھے۔ (بی بی سی ویب سائٹ وغیرہ)

4۔ گیان چند، تحقیق کا فن، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ط۳، ۲۰۰۷ء)، ص ۵۷.

5۔ پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی اس وقت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد میں شعبہ فکر اسلامی، تاریخ و ثقافت کے چیئرمین ہیں۔ وہ یکم اپریل ۱۹۶۷ء کو مانسہرہ خیبر پختون خواہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے وفاق المدارس العربیہ سے شہادۃ العالمیہ کی سند حاصل کی۔ پشاور بورڈ سے میٹرک اور ایف اے کیا۔ بی اے اور ایم اے اسلامیات کی ڈگریاں پشاور یونیورسٹی پاکستان سے حاصل کیں۔ ایم فل اسلامک لاء کی ڈگری ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ سے لی۔ ایم فل اسلامک اسٹڈیز کی ڈگری علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اور اسلامک لاء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسماعیل خان سے ۲۰۱۱ء میں حاصل کی۔ درجنوں کانفرنسوں کا اہتمام اور اُن میں شرکت کی۔ آپ کے چالیس سے زائد تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں اور کئی کتب اشاعت کے مراحل میں ہیں۔ چالیس کے لگ بھگ طلبہ و طالبات نے ان کی زیر نگرانی ایم اے اور ایم فل مکمل کیا ہے۔ اُن کی رہنمائی میں کئی سکالر پی ایچ ڈی کے تھیسس پر کام کر رہے ہیں۔

6۔ محی الدین ہاشمی، پروفیسر ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، (انٹرویو کنندہ: خورشید احمد سعیدی)، (اسلام آباد: کلیہ عربی و علوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، جمعرات، ۵ مئی، ۲۰۱۶ء)، وقت: 2:22 سہ پہر۔ راقم ڈاکٹر ہاشمی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف موضوع کے بارے میں انٹرویو ریکارڈ کروایا بلکہ بعد میں مقالے میں شامل اس انٹرویو کے اقتباسات سُن کر اُن کے دُرست ہونے کی تصدیق و توثیق بھی کی۔ علاوہ ازیں اس مقالے میں اپنا مختصر تعارف شامل کرنے کے لیے ضروری معلومات بھی فراہم کیں۔ فجزاہ اللہ خیرا۔

7۔ پروفیسر ڈاکٹر عبد الحمید خان عباسی ۸ مئی ۱۹۶۱ء کو ضلع ہٹیاں بالا آزاد کشمیر کے گاؤں پاہل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے قریبی سکولوں سے جبکہ ایف اے گورنمنٹ ڈگری کالج چناری آزاد کشمیر سے کیا۔ بعد ازاں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے بی اے آنرز اصول الدین اور ایم اے اصول الدین (تخصص فی التفسیر والحدیث) کی تعلیم پائی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل جبکہ

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انہوں نے پوسٹ ڈاکٹریٹ ملائشیا سے کیا۔ آپ نے ۱۹۹۲ء تا ۲۰۰۱ء آزاد جموں وکشمیر یونیورسٹی میں بطور لیکچرر تعلیمی خدمات سر انجام دیں۔ ۲۰۰۱ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر تعینات ہوئے اور شعبہ قرآن و تفسیر میں تخصص کا آغاز کیا۔ میٹرک تا پی ایچ ڈی کے مختلف کورسز تیار کیے۔ آپ درجنوں تحقیقی مقالات اور کتب کے مصنف ہیں۔ بہترین نصابی کتب تیار کرنے کی وجہ سے ۲۰۰۸ء میں آپ کو صدارتی ایوارڈ "اعزازِ فضیلت" سے نوازا گیا۔ ان کی زیر نگرانی ایم اے اور ایم فل کے درجنوں طلبہ وطالبات اپنی ڈگریاں مکمل کر چکے ہیں۔ وہ پی ایچ ڈی کے کئی اسکالروں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

8۔ عبد الحمید عباسی، پروفیسر ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، (انٹرویو کنندہ: خورشید احمد سعیدی)، (اسلام آباد: کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، جمعہ، ۶ مئی، ۲۰۱۶ء)، وقت: 12:38 دوپہر۔ راقم ڈاکٹر عباسی صاحب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف موضوع کے بارے میں انٹرویو ریکارڈ کروایا بلکہ بعد میں مقالے میں شامل اس انٹرویو کے اقتباسات سُن کر اُن کے دُرست ہونے کی تصدیق وتوثیق بھی کی۔ علاوہ ازیں اس مقالے میں اپنا مختصر تعارف شامل کرنے کے لیے ضروری معلومات بھی فراہم کیں۔ فجزاہ اللہ خیرا۔

9۔ ڈاکٹر حافظ محمد سجاد جنوری ۱۹۶۷ء کو تترال (چکوال) میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ اسلامیہ اشاعۃ العلوم میں ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کے بعد ایف اے، بی اے گورنمنٹ کالج چکوال سے کیا، ایم اے اسلامیات کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے، ایم فل کی ڈگری علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے اور پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایم اے عربی اور ایم ایڈ بھی کیا۔ تدریس کا تجربہ ۱۹۹۴ء میں بطور سبجیکٹ سپیشلسٹ سے شروع کیا، اسی سال لیکچرر سے حیثیت سے ترقی ہوگئی۔ اس کے بعد سنہ ۲۰۰۰ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی سیٹ پر آگئے۔ کچھ عرصہ قبل ان کی ترقی بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوگئی ہے۔ ان کی نگرانی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کی تعداد پچیس سے زائد، ایم فل کی ڈگری مکمل کرنے والے پینتیس سے زائد اور پی ایچ ڈی کا تھیسس مکمل کرنے والے چار ہیں۔ آپ کئی کتابوں اور درجنوں تحقیقی مقالات کے مصنف بھی ہیں۔

10۔ محمد سجاد، ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، (انٹرویو کنندہ: خورشید احمد سعیدی)، (اسلام آباد: کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، جمعہ، ۶ مئی، ۲۰۱۶ء)، وقت: 11:40 دوپہر۔ راقم ڈاکٹر سجاد صاحب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف موضوع کے بارے میں انٹرویو ریکارڈ کروایا بلکہ بعد میں مقالے میں شامل اس انٹرویو کے اقتباسات ملاحظہ کیے اور بعض اقتباسات میں ترمیم کروانے کے بعد اُن کے دُرست ہونے کی تصدیق وتوثیق بھی کی۔ علاوہ ازیں اس مقالے میں اپنا مختصر تعارف شامل کرنے کے لیے ضروری معلومات بھی فراہم کیں۔ فجزاہ اللہ خیرا۔

11- تحسین اقبال، علم تحقیق کا تعارف، حوالہ مذکور، ص ۴۷.

12- معین الدین عقیل، پروفیسر ڈاکٹر، اُردو تحقیق: صورت حال اور تقاضے، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ط ۱، ۲۰۰۸ء)، ص ۳۹۸ و ۴۰۰.

13- الشريف حاتم بن عارف العوني، العنوان الصحيح للكتاب: تعريفه وأهميته، وسائل معرفته وإحكامه ، أمثلة للأخطاء فيه، دار عالم الفوائد للنشر والتوزيع، مكة المكرمة، ط 1، 1419 هـ. اسے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کرنے کا ایک لنک یہ ہے:
http://waqfeya.com/book.php?bid=701

14۔ محمد سجاد، ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور.

15۔ ایضاً۔

16- محی الدین ہاشمی، پروفیسر ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور.

17- امام ابوعبد اللہ محمد بن یزید ماجہ القزوینی (متوفی ۲۷۳ھ)، سُنن ابن ماجہ، (تحقیق: الأرنوؤط)، دار الرسالہ العالمیہ، دمشق، ط ۱، ۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء، (مکتبہ شاملہ سے ماخوذ). ج ۲، ص ۸۵.

18- سُنن ابن ماجہ، حوالہ مذکور، ج ۵، ص ۱۵.

19- امام مسلم (متوفی ۲۶۱ھ)، صحیح مسلم، (تحقیق: محمد فؤاد عبد الباقی)، دار احیاء التراث العربی، بیروت. (مکتبہ شاملہ سے ماخوذ).

20- عبد الحمید عباسی، پروفیسر ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور. ج ۳، ص ۱۲۵۵

21- انٹرنیٹ کی مدد سے سابقہ کام کو جاننے، حاصل کرنے اور استعمال کرنے کے سلسلے میں ملاحظہ ہو: خورشید احمد سعیدی، "علوم اسلامیہ میں تحقیقی مقالے کے موضوع کا اِنتخاب اور خاکہ سازی: جدید رہنما اُصول اور طریقے"، ششماہی علمی و تحقیقی مجلہ "معارف اسلامی"، فیکلٹی آف عریبک اینڈ اسلامک اسٹڈیز، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۱۳، شمارہ نمبر ۱، جنوری تا جون ۲۰۱۴ء، ص ۸۳-۱۱۸.

22- ظہور احمد اظہر، پروفیسر ڈاکٹر، "حدیث نبوی کا بلاغی اعجاز"، مشمولہ سہ ماہی فکر و نظر (سیرت نمبر)، اسلام آباد، ج ۳۰، شمارہ ۱-۲، محرم- جمادی الثانی ۱۴۱۳ھ- جولائی- دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۹.

23- محمد سجاد، پروفیسر ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور.

24- ایضاً۔

25- ایضاً۔

26- ایضاً۔

27- ایضاً۔

28- ایضاً۔

29- ملاحظہ ہو: رشید حسن خان، اردو املا، مجلس ترقی ادب لاہور، ط ۱، ۲۰۰۷ء اور اعجاز راہی، اِملاء و رموز اوقاف کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ط ۱، ۱۹۸۵ء.

30- ملاحظہ ہو: عبد الحمید خان عباسی، پروفیسر ڈاکٹر، اُصول تحقیق، (اسلام آباد: نیشنل بُک فاؤنڈیشن، ط ۲، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۹۱-۳۱۰ اور ص ۳۱۵-۳۲۹.

31- اس سلسلے میں طالب الہاشمی کی کتاب "اصلاحِ تلفظ و اِملا: صحیح بولیے۔ صحیح لکھیے" القمر انٹرپرائزز، لاہور، س ن، کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہو گا۔ یہ انٹرنیٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے۔

32- دیکھیے: ڈاکٹر نثار احمد قریشی، "تحقیق میں زبان اور اُسلوب کی اہمیت" مشمولہ (عطش دُرانی، اُردو تحقیق: منتخب مقالات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ط ۱، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۰۰.

33- ایضاً، ص ۱۹۹.

34- النحل ۱۶: ۱۲۶-۱۲۵

35- احمد سعید کاظمی، علامہ سید، البیان، کاظمی پبلی کیشنز، ملتان، ط ۲، ۱۹۹۸ء.

36- عبد القادر، ڈاکٹر قاضی، تصنیف و تحقیق کے اُصول، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ط ۱، ۱۹۹۲ء)، ص ۵۳.

37- محی الدین ہاشمی، پروفیسر ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور۔

38- مثلاً ملاحظہ ہو: ڈاکٹر معین الدین عقیل کا مقالہ "جدید رسمیاتِ تحقیق"، ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی کا مقالہ "اُردو میں حوالہ نگاری"، ڈاکٹر ارشاد احمد شاکر اعوان کا مقالہ "حواشی و تعلیقات" مشمولہ: عطش دُرانی، اُردو تحقیق: منتخب مقالات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ط ۱، ۲۰۰۳ء؛ مزید دیکھیے: ڈاکٹر عطش دُرانی، جدید رسمیاتِ تحقیق، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ط ۱، ۲۰۰۵ء کا گیارہواں باب (اُسلوبیات) اور تیرہواں باب (حوالہ و کتابیات نگاری)۔

39- ملاحظہ ہو: عبد الحمید خان عباسی، پروفیسر ڈاکٹر، اُصول تحقیق، حوالہ مذکور، ص ۳۳۳۔۳۵۳ اور ۳۵۷۔۳۶۸.

40- محمد سجاد، ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور۔

41- اس سلسلے میں بہت ہی معلوماتی اور سبق آموز گفتگو ملاحظہ ہو: محمد عارف، پروفیسر، تحقیقی مقالہ نگاری: طریق کار، (لاہور: ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی، ط ۱، ۱۹۹۹ء)، ص ۲۴۴۔۲۵۲. پروفیسر محمد عارف صاحب گورنمنٹ کالج ایم اے او کالج لاہور میں وائس پرنسپل رہے۔

42- امام ابو بکر بیہقی، شعب الإیمان، (ت: ڈاکٹر عبد العلی)، (بمبئی، ھند: مکتبۃ الرشد، ۱۴۲۳ھ۔ ۲۰۰۳ء)، ج ۱۳، ص ۳۵۵.

43- پروفیسر ڈاکٹر سمیع الحق بن مفتی عبد الدیان خیبر پختون خواہ کے ضلع چترال کے گاؤں ژنگ بازار میں ۱۱/ فروری ۱۹۵۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا زیادہ عرصہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں بسر ہوا۔ اسی یونیورسٹی کے کلیہ اصول الدین (اسلامک اسٹڈیز) ہی میں اُن کی تعیناتی ہوئی۔ وہ اس کلیہ کے شعبہ تفسیر اور علوم القرآن میں پڑھتے پڑھاتے رہے۔ اُن کے زیر نگرانی ایم اے اور ایم فل مکمل کرنے والے طلبہ و طالبات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے پی ایچ ڈی کے کئی طلبہ کی رہنمائی کی اور کر رہے ہیں۔ مارچ ۲۰۱۶ء میں وہ اس یونیورسٹی سے ریٹائر ہو گئے۔

44- سمیع الحق، پروفیسر ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، (انٹرویو کنندہ: خورشید احمد سعیدی)، (اسلام آباد: کلیہ عربی و علوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، جمعہ، ۲۴ مئی، ۲۰۱۶ء)، وقت: 2:18 دوپہر۔ راقم ڈاکٹر سمیع الحق صاحب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف موضوع کے بارے میں انٹرویو ریکارڈ کروایا بلکہ بعد میں مقالے میں شامل اس انٹرویو کے اقتباسات سُن کر اُن کے دُرست ہونے کی تصدیق و توثیق بھی کی۔ علاوہ ازیں اس مقالے میں اپنا مختصر تعارف شامل کرنے کے لیے ضروری معلومات بھی لکھوائیں۔ فجزاہ اللہ خیرا۔

45- ایضاً۔

46- ایضاً۔

47- محمد سجاد، ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور۔

48- عبد الحمید عباسی، پروفیسر ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور۔

49- ایضاً۔

50- ایضاً۔

51- محمد سجاد، ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور۔

52- ایضاً۔

53- محی الدین ہاشمی، پروفیسر ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور۔

54- محمد سجاد، ڈاکٹر، ذاتی انٹرویو، حوالہ مذکور۔

55- ایضاً۔